سنگِ میل

سنگِ میل

نورِ یقین ہے سرمہ کشِ چشمِ اعتبار
منزل کا چل رہا ہے پتہ سنگِ میل سے

یعقوب عثمانی

بے روحِ اثر سخن میں کیا رکھا ہے
ذکرِ گل و یاسمن میں کیا رکھا ہے
کس کام کا پیکرِ طلسمِ الفاظ
تصویر کے پیرہن میں کیا رکھا ہے

یعقوب عثمانی

سازِ مضامین

جھلکیاں[1]

جناب سید سلیمان ندوی۔

"آج کل سب سے ارزاں جنس اور شہرت کا سب سے آسان نسخہ شاعری ہے۔ ہر وہ نو آموز جو اپنی خوش گلوئی سے عوام کو متوجہ کر سکتا ہو، جلد شہرت و مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ان حشرات الارض شعرار کے علاوہ ایسے سنجیدہ اور با مذاق شاعر بھی نظر آجاتے ہیں جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود عام نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ انھیں میں مصنف "شعر و نغمہ" بھی ہیں۔ اگرچہ ان کے نام اور کلام سے آج پہلی مرتبہ واقفیت ہوئی ہے مگر پہلی ہی نظر میں اس کا اندازہ ہو گیا کہ وہ خیالات، طرز ادا، صحت و صفائی زبان اور محاسن شاعری کے اعتبار سے صحیح معنوں میں شاعر ہیں اور آج کل کے بہت سے مقبول عوام شعرار کے کلام سے ان کا کلام بہتر ہے۔ مصنف کا

---

[1] مصنف کے پہلے مجموعۂ کلام کے متعلق اہل نظر کے خیالات۔

نوٹ:۔ رایوں کی ترتیب میں صرف وصول ہونیکی تاریخ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

لکھا ہوا مقدمہ بھی ان کے ذوق شعری کا آئینہ دار ہے۔"

۱۱ر جنوری ۱۹۵۱ء

جناب جوشؔ ملیح آبادی۔

"ہر چند مجھے غزل کے بنیادی تصور سے اختلاف ہے لیکن یعقوب صاحب کی غزلوں میں میں نے وہ بات پائی جو روایتی غزلوں سے قطعی مختلف ہے۔

یعقوبؔ صاحب عصر حاضر کی الجھنوں اور سیاسی پیچیدگیوں کو غزل کی زبان میں شیرینی اور دل کشی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے ان کی ادبی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے اور قدیم یعقوب کے علی الرغم ان کی آنکھوں میں روشنی دکھتی نظر آتی ہے۔"

۵ر اپریل ۱۹۵۴ء

جناب قاضی عبد الغفار۔

"یعقوب عثمانی صاحب کے کلام کا تعارف کرانا اتنا ہی مشکل ہے جس قدر کہ کسی حساس شاعر اور آرٹسٹ کے کلام کا تعارف کرانا۔ میں کیسے بتاؤں کہ شاعر نے جب کوئی مصرعہ لکھا تو اس کے قلب و دماغ پر کیا عالم وارد تھا! کسی شاعر کے کلام کو ایک مسلمہ معیار پر پرکھنا بہت ہی بے معنی سخن فہمی ہے کوئی ایسا مسلمہ معیار ہے کہاں! میں تو اکثر شعر و سخن کو دو طرح تقسیم کرتا ہوں۔ ایک الفاظ کی رنگ آمیزی و دستکاری اور ایک فطری آرٹسٹ کے احساس کا بے محابا تقاضا۔ میرا ذوقِ سخن کسی اور پیمانے سے واقف نہیں۔

یعقوب صاحب خود دستکاری اور حقیقت نگاری کے فرق کو محسوس کرتے

ہیں. جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

رسا ذوقِ یقیں ہے بھی تو انداز بیاں تک ہے

ابھی محدود مفہوم حقیقت داستاں تک ہے

داستان آرائی اور انداز بیان کی حدود سے کچھ آگے بڑھ کر وجدان کی سرحد

شروع ہوتی ہے۔ اسی جگہ شاعر "شمع زیرِ دامانِ تصور" کی روشنی پاتا ہے۔

یعقوب صاحب کے کلام میں جا بجا بے اختیاری نظر آتی ہے وہی شاعری

کی روح ہے۔ اختیار کی حد تک فن کا کمال ہے اور بے اختیاری وجدان کی

سلطنت ہے۔" ۱۰ مئی ۵۴ء

پروفیسر سید احتشام حسین۔

"میں نے یعقوب عثمانی صاحب کا مجموعۂ کلام "شعر و نغمہ" دیکھا۔ اسے پڑھتے

ہوئے بار بار مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ایک دردمند دل کی آواز سن رہا ہوں جسے

مترنم الفاظ میں ڈھال لیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں خیالات کی پختگی کے ساتھ ساتھ

اندازِ بیان کی پختگی بھی ملتی ہے پھر خوبی یہ کہ عام واردات اور جذبات کی تصویریں

فرسودگی سے بچ کر پیش کی گئی ہیں۔" ۱۴ مئی ۵۴ء

جناب نیاز فتح پوری۔

"اس وقت شعر گوئی کے رجحانات بڑی حد تک غیر ادبی ماحول کی پیداوار

ہیں اور ادب برائے زندگی کے نظریے نے شاعری میں بہت کچھ لایعنیات کو
بھی شامل کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں شاعری بڑی وسیع چیز ہے جذبات کے
لحاظ سے لیکن فنی حیثیت سے وہ محدود بھی ہے اور اسی تنگی میں کائنات کی سی
وسعت پیدا کرنا شاعری کا کمال ہے، جس کی مثالیں جناب یعقوب عثمانی کے
کلام میں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری حسن و عشق کے رمزیات سے جدا نہیں لیکن
جذبات واحساسات کی بلندی اور اسلوب اظہار کی ندرت نے اسے اس
درجہ دل کش بنا دیا ہے کہ ان کے اکثر اشعار سن کر ہم چونک پڑتے ہیں اور
ایک سنجیدہ اور دل کش فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔

ان کے کلام کی جس خصوصیت نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا عمومیت
اور اسقام سے پاک ہونا ہے۔ وہ اپنے اکتسابات علمی کے لحاظ سے ایک
فاضل شخص ہیں اور ان کی اسی فضیلت نے شعر و سخن میں وہ فنی پختگی پیدا کردی
ہے جو آج کل بہت کم شاعروں میں پائی جاتی ہے۔"

۲۳ رمئی ۵۴ء

پروفیسر آل احمد سرور

"شعر و نغمہ" یعقوب عثمانی کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ ان کے حال و مقال
دونوں میں خلوص اور ذوق سلیم کی جھلک ہے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں
تعلیمی اداروں سے فیض حاصل کیا ہے اور ہمارے ادب کی روایات، ہماری

قومی خصوصیات، مشرقی تہذیب کے اہم عناصر کے ساتھ موجودہ دور کے پیچ و خم
اور اس کے انقلابی رجحانات کو بھی جذب کیا ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی،
روانی، خلوص اور دردمندی ہے۔ وہ شعریت کے پرستار ہیں اور یہ بڑی بات
ہے کہ شعریت کی افادیت، اس کی بصیرت اور زندگی کے اچھے میلانات کو بیدار
کرنے میں اس کی صلاحیت کو وہ تسلیم بھی کرتے ہیں اور برتنا بھی چاہتے ہیں۔ انھوں
نے ابھی تک اپنی تمام تر توجہ غزل پر صرف کی ہے۔ غزل ایک بت ہزار شیوہ
ہے اور ہر دور میں زندگی کے اہم میلانات کو اپنی مخصوص زبان میں اور اپنے رمز و
ایما کے پیرایہ میں ظاہر کرتی رہی ہے۔ آج بھی ظاہر کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔
یہ داخلیت کی آواز ہے مگر اسی داخلیت میں خارجیت جس طرح پھوٹ نکلتی
ہے اسے اہل نظر جانتے ہیں۔ اچھا غزل گو داخلیت اور خارجیت کے اس ربط
انفرادیت اور ماحول کے اس رشتے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔

یعقوب صاحب کے کلام میں شعریت اور روانی کے ساتھ صحت زبان
کا التزام ملتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ان کا شعور اور پختہ ہوتا جائے
گا، زندگی کے نتیجہ خیز حقائق کی عکاسی میں وہ اور زیادہ کامیاب ہوں گے۔"

۱۶ر جون ۵۴ء

جناب عبدالماجد دریابادی۔

"یعقوب عثمانی صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام زیر اشاعت ہے۔ ان کا

مجموعہ اوّل "شعر و نغمہ" میری نظر سے گذرا ہے۔ اہل تجربہ کا قول ہے کہ نقش ثانی نقش اوّل سے بہتر ہی ہوتا ہے۔

"شعر و نغمہ" کی ایک غزل میری نظر میں۔ ہے اور وہی شاعر کو رسمی غزل گویوں کی صف سے نکال کر حقیقی شاعروں کی محفل میں لا بٹھا دینے کے لئے کافی ہے ؎

ڈھونڈھتا لذتِ حیات کہاں

میں کہاں یہ تکلفات کہاں

ایک شعر بھرتی کا نہیں، غزل کی غزل مرصع، کسی شعر پر کلام مومن کا دھوکا اور کوئی غالب کے رنگ میں ڈوبا ہوا .... باوجود اس کے یعقوب کی انفرادیت ہر جگہ قائم۔

شاعر کی یہ ایک ہی غزل شاعر کی خوش مذاقی، شگفتگی، شستگی، شائستگی اور شرافت پر دلیل ناطق ہے۔ اور "شعر و نغمہ" میں اس پائے کی غزلوں کی کمی نہیں"

۲۶ رجون ۵۴ء

جناب جعفر علیخاں اثر لکھنوی۔

"شعر و نغمہ" جناب یعقوب عثمانی کا پہلا مجموعہ ہے میں اس کے مطالعہ سے بہت محظوظ ہوا۔ ان کے کلام میں پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے۔ لطافت ہی لطافت ہے۔ احترام عشق کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اس لفظ کو کسی شعر میں آنے ہی نہیں دیا۔ اس کی وجہ ان کے ہی الفاظ میں سنئے۔

"عشق تغزل کی جان ضرور ہے لیکن اس لفظ کی مقدس معنویت سے احتراماً ڈرتا ہوں سوا لفظ محبت یا شوق کے، اس کے استعمال کی جرأت کبھی نہیں کرتا۔"

ہاں صاحب عشق ہیئی ایسی بلا۔ اس کی شوریدگی و سرشاری، خود رفتگی و سپردگی، خدا کی پناہ! حد ہو گئی کہ اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں عشق کو اپنے سے منسوب نہیں کیا؛

مگر میں اتنا عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ عثمانی صاحب عشق کا نام نہ لیں تو نہ لیں، ان کا کلام عشق کی جیتی جاگتی تصویر اور اس کی ظرفہ کاریوں کا دل کش مرقع ہے۔ ان کے کلام کا کیف اس شعر کا مصداق ہے ؂

چیست دانی بادۂ گلگوں؟ مصفا جوہرے
عشق را پروردگارے، حسن را پیغمبرے"

۴؍ جولائی ۵۴ء

پروفیسر عبدالقادری سروری۔

"شعر و نغمہ" کہنے کو تو غزلوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں جا بجا اسلوب اور فکر کے وہ سارے نقوش ملتے ہیں جو عصر حاضر میں نظم کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں اس دور کی فکر لطیف کا نمونہ ہیں۔ غزل کا محور ہمیشہ حسن و عشق رہا ہے، اس لحاظ سے اس مجموعہ میں بھی عشق و محبت کے رموز کی کمی نہیں۔ تاہم اگلے ادوار کے تصور عشق و محبت کے مقابلے میں اس مجموعے کی غزلوں میں

تصورِ عشق و محبت بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں عشق و محبت کی داستانوں میں عمومیت ہے، جس کے باعث جذبات اور واردات جو شخصی یا انفرادی انداز میں پیش کئے گئے ہیں وہ ایک عالم کے تجربات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر اس مجموعہ کی غزلوں کے موضوع محض حسن و عشق کے لاگ اور لگاؤ کے ابدی موضوع ہی نہیں ہیں، بلکہ ان میں شاعر کی فکر بہت سی عالمی حقیقتوں کو بھی پیش کرتی ہے۔

شعر کا پیرایۂ بیان درحقیقت شعر کی جان ہوتا ہے اس اعتبار سے اس مجموعے کو دیکھا جائے تو شاعر کو دل کش اسالیب اور پیرایۂ بیان پر جو قدرت حاصل ہے اس کے باعث "شعر و نغمہ" کے صفحات دامان باغباں اور کفِ گل فروش نظر آتے ہیں۔"

۸ راگست ۵۴ء

گل ریز ہے، طغرا کشِ اوہام نہیں ہے
پختہ ہے مرا ذوقِ نظر، خام نہیں ہے

یعقوب عثمانی

قدم اوّلیں

آوارگی است رہبر در وادئ محبت
طوفان بود معلّم دریائے بیکراں را (عرفی)

"سنگ میل" میں میرے افکار کی بدلی ہوئی رفتار پر ناظرین تعجب نہ فرمائیں۔ فریب خیال میں آکر کبھی کبھی راہرو راہِ منزل ہی کو منزل سمجھ بیٹھتا ہے لیکن آگاہ ہو جانے پر اگر وہ دوبارہ منزل کی تلاش میں نکلے تو یہ عمل ذوقِ طلب کے منافی نہیں ہو سکتا۔ منزل ایک عجیب دوراہا ہے راہ طلب یہاں ختم بھی ہوتی ہے اور یہاں سے شروع بھی ہوتی ہے۔ یہ تضاد جذبۂ جستجو کی شدت و ضعف کا کرشمہ ہوا کرتا ہے۔

"شعر و نغمہ"[1] کی ترنم ریز فضا زیادہ عرصے تک میرے تخیل کی جولانگاہ نہ رہ سکی۔ حالات نے فکر و نظر کے سامنے ایک ایسا موڑ پیش کر ہی دیا جس کے اختیار کرنے پر فطرت مجبور تھی۔ کشمکشِ حیات کی بے نقاب کی ہوئی حقیقتوں سے آنکھیں پھیری نہیں جا سکتیں۔ فکری قوت کو زندگی کی حرکت کا تابع ہونا ہی پڑتا ہے۔

---

[1] میرے پہلے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔

شاعری کا دار و مدار وجدان پہ ہے۔ خود وجدان کی صورت یہ ہے کہ بار بار پیش آنے والے میلانات کی ترتیب اس کا مشغلہ ہے۔ تجربات کی مدد سے وہ اس قسم کے غیر منظم میلانات میں ایک باقاعدگی پیدا کرتا ہے، تصورات کو ان کا مرکز بناتا ہے اور تجربات کی وسعت کے ساتھ ساتھ اپنا احاطۂ اقتدار بڑھاتا رہتا ہے۔

دنیا میں ہر چیز کا وجود وقت کا اقتضا ہوا کرتا ہے۔ زندگی کے تمام پہلو خواہ وہ وجدانی ہوں خواہ ذہنی، خواہ تجرباتی ہوں خواہ عملی، زمانے کے اشارے پر بدلتے رہتے ہیں۔ محسوسات کی طرح جذباتی نظام بھی تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ شاعری کے موضوع وہی مسائل ہو سکتے ہیں جنھیں زندگی ہمارے سامنے لاتی رہتی ہے۔ ادب فرضی یا خیالی داستانوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اسے اپنے دور کے طبقاتی حیاتی اور ذہنی رجحانات کا ترجمان بننا ہی پڑتا ہے۔

پرانی روش کو صرف اس لئے چھوڑ دینا کہ وہ پرانی ہے اور نئی روش کو محض اس لئے اختیار کر لینا کہ وہ نئی ہے، نہ دانشمندی ہو سکتی ہے نہ ترقی پسندی۔ میں نے احساس اور فن کی رہنمائی میں اپنے رجحانات کے اس نئے موڑ کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ ادراک میں جو تغیرات واقع ہوتے ہیں وہ عام طور پر فطرت، سن اور سابق معلومات کے زیر اثر واقع ہوتے ہیں۔ میرا یہ اقدام کورانہ تقلید کا پرتو نہیں ہے، تجرباتی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کھلی ہوئی حقیقتوں سے انحراف میرا شیوہ نہیں، ہر چیز کو ایک ہی آئینۂ خیال میں دیکھنے کا میں عادی نہیں،

غور اور فکر کی میزان میں تول لینے کے بعد مفید اور برمحل تصرف سے میں اجتناب نہیں کرتا، مجھے نہ اپنی غلطی کے اعتراف میں تامل ہوتا ہے اور نہ دوسروں کی غلطی کے اظہار میں، بشرطیکہ وہ واقعیت پر مبنی ہو۔

جہاں تک آج کی زندگی کے تقاضوں کا تعلق ہے، ان کی اہمیت ناقابل تردید ہے۔ یہ ادب اور وقت دونوں کے ایسے مطالبات ہیں جنکی تکمیل کا ذمہ دار ہر مفکر اور ہر فنکار رہے ہے۔ حسن بیان اور لطف زبان کو مدعائے شاعری سمجھ کر اس کی ہمہ گیر وسعتوں کا خون نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری ساز حیات کا نغمہ ہے۔ اس کی نغمگی محفلوں ہی کی پابند نہیں رہ سکتی۔ شاعری کی غرض وغایت حقائق زندگی کی مرقع کشی ہے یہ مفروضات کی مرصع کاری کے لئے وقف نہیں ہو سکتی۔ شاعری، انسانی شعور اور خارجی موجودات کا درمیانی رابطہ ہے، تحریکی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ قائم ہونے والے نظریات اور بدلنے والے حالات وقت کی آواز بن کر شاعر کے قلب ودماغ میں گونجتے رہتے ہیں۔ اس کا تعلق انفرادی اور اجتماعی حالات سے یکساں رہتا ہے۔ یہ سب ایسی بداہتیں ہیں جو کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ ہاں یہ چیز محل نظر ضرور ہے کہ اس غیر متوازن دور حیات میں کیا شاعر بھی اعصابی ہیجان سے تنگ آکر توازن شعری سے دست بردار ہو سکتا ہے؟

فن کی بنیاد انسانی کارکردگی پر ہوا کرتی ہے۔ فنی ذوق ندرتِ فکر وعمل چاہتا ہے تاکہ زندگی میں نئے نئے اعجاز رونما ہوں۔ اس سے بے توجہی برتنا اپنے

آپ کو جان بوجھ کر جمود کا شکار بنا دیتا ہے۔ شاعری اور فن دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حالات، مشاہدات، محسوسات، تصورات اور خیالات کی تبدیلی کا اثر فن پر اگر پڑتا ہے تو اتنا پڑتا ہے کہ صنعت کارانہ عمل کی قدریں بدل جاتی ہیں، خود فن کے اساسی اصول ہرگز نہیں بدلتے۔ فن کا مقصد حواس اور شعور کو اشیاء کی پاکیزگی تک پہنچانا ہوتا ہے۔ ہر شے کو اس کی عام حالت سے بلند و بالا کر دکھانا فن ہی کی طرفہ کاری ہے۔ حسن ایک ترکیبی کیفیت ہے کئی چیزوں کے متناسب امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مبصر فنکار سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

خیال شعر کی روح ہے اور زبان و بیان جسم۔ بقا کے لئے روح کو جسم سے جو سروکار ہے اس سے سب ہی باخبر ہیں شعر اس عام قانونِ بقا سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

سوئے اتفاق دیکھئے کہ آج سے پہلے ہماری شاعری کی دنیا میں اگر بے روح ڈھانچوں کی فراوانی تھی تو آج بھٹکتی ہوئی روحوں کی ارزانی ہے۔ کسی دور میں ایسے اشعار کی کثرت نہ ملے گی جو اپنی صوری و معنوی کیفیتوں سے سراپا اثر بن سکے ہوں۔ شعر و ادب کی راہِ ترقی میں جو جو رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں ان میں سے بعض کا تو سدباب ہی نہ ہو سکا اور بعض ردِ عمل کے اصول پر اپنی ہئیت کذائی بدل کر سامنے آگئیں۔ کمال فن کے نمونے معین تعداد سے آگے

نہ بڑھنا تھے نہ بڑھے. گروہ بندی کی پیدا کردہ تنگ نظری، تخلیقی قوتوں کے دبانے والے تقلیدی عناصر، طبع آزمائی کے لئے مخصوص موضوعات کا تعین، یہ ایسے صحت دشمن جراثیم ہیں جنھوں نے ادب کو اب تک پنپنے نہ دیا. کل اگر منتہائے نظر صرف محبت تھی تو آج مرکز فکر صرف مادی افادیت ہے. کل اگر مقصد شاعری صرف خدمت زبان تھا تو آج ماحصل شاعری صرف چند خاص خاص مسئلوں کا معرض بحث میں لانا ہے.

مجھے اس عرض خیال کے بعد قارئین" سنگ میل" کے سامنے کوئی ایسا نمونۂ کلام نہیں پیش کرنا ہے جو عیوب سے پاک ہو. یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں جنھیں ایک خدمت گزار ادب کی حیثیت سے چھپا نہیں سکتا. بدنمائی پیدا کرنے والی ادبی خامیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے.

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عروض و معانی کی بندشیں بہت سی دشواریوں کا باعث ہو جایا کرتی ہیں. فنکار کو ہر ہر قدم پر عرق ریزی کی دعوت دیتی ہیں. بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اہتماموں کے ساتھ فکر سخن دشوار کام ہے لیکن زحمت سے جی چرا کر اشعار کے سر ذوقِ سلیم کا یہ اعتراض عائد کرا دینا کہ معیار پر پورے نہیں اترتے ہیں، سہولت پسندی ہوگی ادب دوستی نہ ہوگی. وزن ہو یا قافیہ ان کا لزوم اصناف سخن میں اس لئے نہیں رکھا گیا ہے کہ صوتی حسن میں اضافہ ہو جائے، ان سے شعر کی قوت تاثیر بھی بڑھ جاتی

ہے۔ نثر کی نامحدود راہوں میں چکر لگانے والا خیال جب شعر کے حدود میں آجاتا ہے تو اس کے ذہن نشین ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ حافظہ بھی اسے جلد قبول کرلیتا ہے اور شعور و احساس بھی شعر کے لئے وزن کوئی روایتی بندش نہیں ہے بلکہ شعر کی ماہیت اور افادیت دونوں کا مقتضا ہے۔

آب وہوا یا ماحول کے فرق سے ہر قوم کے خیالات اور جذبات میں اختلاف ضروری ہے۔ خیالات اور جذبات کی مناسبت سے انداز بیان میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ کوشش کہ اردو شاعری کو اپنے ماحول کی عکاسی کے لئے ہو بہو وہی پیرایہ اختیار کرنا چاہئیے جو بعض خاص خاص زبانوں کا ہے، ایک عجیب سی کوشش ہے۔ وزن اور لحن کی ساخت زبان کی ساخت کی پابند ہوا کرتی ہے۔ دوسری زبانوں کی آزاد نظم اردو کے لئے ایک تقلیدی اقدام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مرکزی خیال کی حد تک کسی اور زبان کے ادب سے اخذ و استنباط میں کوئی قباحت نہیں، اس سے اپنے ادب کا ذخیرہ بڑھتا ہے، اس میں اگر وجدانی خصوصیتوں اور جمالی خوبیوں سے کام لیا جاتا ہے تو اس کی جدت اسے نقش نو کا مرتبہ دلا دیتی ہے۔ لیکن دوسروں کا چربا اتارنے میں اپنے قوانین ادب کا توڑ دینا اپنے ادب کی توہین ہے۔

اظہار خیال کے سلسلے میں الفاظ کا انتخاب شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک زبردست سوال ہوا کرتا ہے۔ ترادف یا اشتراک صرف لغوی معنی کی حد

تک ہوتا ہے، محل استعمال کے اعتبار سے دو لفظوں میں ترادف مشکل ہے۔ ہر لفظ اپنا مستقل مقام رکھتا ہے جہاں اس کے سوا دوسرا لفظ برمحل ہو ہی نہیں سکتا۔ بیان کے لئے الفاظ وہی موزوں ہو سکتے ہیں جو سننے والے یا پڑھنے والے کو پیش شدہ خیال کی ماہیت سے قریب تر کر دیں۔ الفاظ میں اتنا لوچ اور اتنی نرمی ہونی چاہیئے کہ وہ خیال کی وسعت کو اپنے اندر سمولیں۔ الفاظ اور خیال میں باہمی یک جہتی ہونی چاہیئے، اثر ان دونوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ نامناسب اور بے محل الفاظ نہ صرف سامعہ پر گراں گزرتے ہیں بلکہ افادیت کو بھی مجروح کر دیتے ہیں۔

نشست الفاظ میں ترتیب اور ایک لفظ کی دوسرے لفظ سے صوتی وابستگی بھی توجہ کی محتاج رہا کرتی ہے۔ منہ سے نکلتے وقت جو آواز جس قدر کم ٹوٹتی ہے لسانیاتی اصول پر اُسی قدر خوشگوار کیفیت پیدا کرتی ہے۔ بندشوں کی چستی اثر آفریں نہ سہی لیکن اثر آفرینی میں ممد و معاون ضرور ہوتی ہے۔

شاعر اور غیر شاعر کا فرق یا دو شاعروں کا باہمی امتیاز طرز ادا سے ظاہر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی شاعر یا ادیب کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنا ہو تو اس کی تصنیف کے آئینے میں دیکھنا چاہیئے۔ ہر شاعر کا مخصوص طرز ادا اس کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا ہے۔ شعر کی طرح طرز ادا کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں، ایک داخلی جس کا تعلق نفس خیال سے ہوتا ہے اور دوسرا خارجی جس کا

تعلق زبان و بیان سے ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنی شاعرانہ انفرادیت ان دونوں اعتباروں سے باقی رکھنی چاہیئے۔ تتبع کی کوشش خصوصیات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ایک ہی مرکز اور ایک ہی طرز پر سوچنے اور لکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شاعر کے نتائج افکار ملتے جلتے نظر آتے ہیں، تنوع مفقود ہو جاتا ہے شعر و ادب کی رفتار دل آویزی سست پڑ جاتی ہے۔ دوسرے مفکروں کے سوچے ہوئے نظریوں کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا اور موزونیت طبع کی مدد سے شعر یا نظم کے سانچے میں ڈھال دینا شان مفکری کے خلاف ہے۔ اس طریق کار سے ایک طرف قوت فکری معطل ہوتی جاتی ہے اور دوسری طرف سرمایۂ شاعری محدود ہوتا جاتا ہے۔ شاعر کو اپنے اصلی خد و خال میں دنیا کے سامنے آنا چاہیئے نہ کہ دوسروں کے لباس میں۔

شاعری زندگی کے صحیح اندازوں کی تفسیر کرتی ہے۔ اس کی پہنائیوں کو چیدہ چیدہ موضوعات پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ مادی زندگی نامیاتی حقیقت ہے اور بیشک ہے مگر اس کا مفہوم یہ تو نہیں ہو سکتا کہ زندگی سے متعلق اس سے ہٹ کر کچھ سوچا ہی نہ جائے، زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جو حاصل انسانیت ہیں کسی طرح پس پشت نہیں ڈالی جا سکتیں۔ زندگی کو بعض ابدی قوتیں بھی ودیعت کی گئی ہیں انھیں مادی مفاد سے ٹکرایا نہیں جا سکتا۔

زندگی کی مادی پستیوں پر تبصرہ شاعر کا فریضہ ضرور ہے مگر اسے آلائشوں سے پاک کر کے بلندیوں کی طرف لے جانا بھی تو شاعر ہی کے فرائض میں داخل ہے۔ جذبات ذہن کے باطنی جوہر ہیں انھیں پاکیزگی سے دور رکھنا ان کے ساتھ کھلی دشمنی ہوگی بعض ایسی صداقتیں بھی ہیں جو حواس ظاہر کی محتاج نہیں ہیں، ہر معاملے میں حواس ظاہر ہی کو حکَم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ محبت ایک دوامی اور بے پایاں حقیقت ہے اس پر جنسی میلانات کے پہرے بٹھا دینا، فطرت کے ساتھ ناانصافی ہے۔

سیاست اور ادب دو جداگانہ موضوع ہیں۔ وقت اور حالات کی رو میں کسی سیاسی مسئلہ کا شعر یا نظم میں آجانا اور بات ہے اور شاعری کو زبان سیاست بنا دینا اور شئے ہے۔ شعر میں سیاسی مطالبات سے زیادہ زندگی کے عام تقاضوں کی گنجائش ہونی چاہیے۔

کسی مخصوص زاویہ نگاہ سے دوسروں کے اشعار کی پرکھ بصیرت افروز کبھی نہیں ہو سکتی۔ اپنی لطف اندوزی کے لئے ذوق کو رہنما بنایا جا سکتا ہے مگر کسی کی دماغی کاوشوں پر لب کشائی ناقدانہ وسیع النظری کی فضا سے دور رہ کر نہیں کی جا سکتی۔ ایسے موقع پر تخلیقی قوتوں کے مظاہر کی نئی نئی راہوں کے ساتھ ساتھ مڑنا پڑتا ہے۔ نظر کو عصبیت اور جانبداری کی دسترس سے بچانا پڑتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سوچنے والا ایک طرح سوچے۔ صحت اور

عدم صحت کا فیصلہ فنی اور مقصدی معیار پر کرنا چاہیئے۔

شعر کوئی معمہ یا چیستان نہیں ہوتا۔ اسے عام فہم ہونا چاہیئے۔ سلاست اور روانی شعر کی جان ہے، لیکن یہ بھی سوچنے کی چیز ہے کہ شعر آپس کی بات چیت تو نہیں ہے۔ ایک لطیف فن کا ستھرا نقش ہے۔ ترفع اس کے خمیر میں ہے۔ اس کی تہہ میں چھپی ہوئی معنویت پر سب کی نظر تو نہیں پڑ سکتی۔ یہ امید کہ اپنی دماغی بلندیوں کو اگر پستی کی طرف مائل کر دیا گیا تو ہر شخص مضمون شعر سے مستفید ہو سکے گا، موہوم امید ہے دوسروں میں مکمل مشاہداتی احساس پیدا کرنے کے لئے ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ ان کے ذہنوں میں اس احساس سے متعلق معلومات اور ادراکی مواد موجود ہو ورنہ بسا اوقات اثر الٹا ہوتا ہے، تحیر احساس کی جگہ لے لیتا ہے اور مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ کوشش ضرور ہونی چاہیئے کہ بلندیوں کا شعور زیادہ سے زیادہ عام ہوتا جائے تاکہ معیاری ادب سے روشناس ہونے والوں کی اکثریت ہو جائے۔

بات کو ضرورت سے زیادہ طول دینا جہاں حافظے کے لئے بار گراں ہوتا ہے وہیں حسن و لطافت کا جوہر بھی گھٹا دیتا ہے۔ الفاظ کو مختصر اور جامع ہونا چاہیئے، ان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ اپنے اصل معنی کے علاوہ ذہن کو متعلقات خیال کی جانب منتقل کر سکیں۔ شعر زیادہ تر مشاہدے یا تجربے

کا داخلی پہلو نمایاں کرتا ہے، ذہنی شکل یا قلبی تاثر کا خاکہ کھینچتا ہے اس میں مادی ذریعہ ہلکے سے ہلکا اختیار کرنا چاہیئے۔ لطیف فنی شہ کاروں کے وجود میں آنے کے لئے مادی وسائل درکار ضرور ہوتے ہیں مگر ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ صناع کے فنکارانہ نقوش کی جگہ ناظرین یا قارئین کے دماغ میں نکل آئے۔ امتیازی حیثیت ذہنی اور باطنی پہلو کی ہوتی ہے۔
شعر میں نثر کی جیسی وضاحت مفید نہیں ہو سکتی۔ اس سے شعریت اور معنویت دونوں کو ٹھیس لگتی ہے۔ وہ ہلکی سی تشنگی جسے پر کیف اشارات اور نازک علامات پیدا کر دیا کرتے ہیں، سخن فہموں کو غور و تامل کی طرف لے جاتی ہے اور اس سے بہت سے پوشیدہ نکات خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ واقعاتی حقیقت نگاری اور شاعرانہ حقیقت نگاری میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہاں لفظوں کے ذریعہ حقیقتوں کی تصویر کھینچنے کے بجائے اپنے جذبات کی کیفیت دوسروں پر طاری کرنی پڑتی ہے۔
غزل اردو شاعری کی ایک کار آمد صنف ہے۔ شعریت میں ڈوبی ہوئی وسعت اور جامعیت کی آئینہ داری یہی کر سکتی ہے۔ اس کی رسائی واردات حسن و عشق ہی تک محدود نہیں ہے۔ گوناگوں جذبات اور بوقلموں احساسات کے بل بوتے پر یہ ہر شعبۂ زندگی کا جائزہ لے سکتی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس لطیف صنف میں خارجی امور کی گنجائش کم نکلتی ہے اور نکلتی بھی ہے تو اسی وقت جبکہ

اس کی آمیزش کسی داخلی کیفیت سے ہو۔ غزل میں تسلسل نہیں ہوتا لیکن اس کے اشعار کی انفرادیت بھی ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ جذبات میں منطقی ربط نہیں مل سکتا۔ ایک ہی منظر کسی وقت کیف پیدا کر دیتا ہے اور کسی وقت بے کیفی۔ نفسیاتی طور پر ایک شعور دوسرے شعور میں تحلیل بھی ہو سکتا ہے اور اصل مرکز کو باقی رکھتے ہوئے اردگرد کے حاشیوں کو بدل بھی سکتا ہے۔ جذبات کے ابھرنے میں طرزِ نگاہ کا بہت بڑا لگاؤ ہوتا ہے۔ طرزِ نظر ہر مشاہدے کی اضافی حالت بدلتا رہتا ہے، ایک ہی عقیدے پر جب مختلف گوشوں سے غور کیا جاتا ہے تو حاصلِ غور یکساں کبھی نہیں رہتا۔ خیال ہو یا جذبہ، فطرتاً زیادہ دیر تک کسی ایک ہی مرکز سے اپنی وابستگی نہیں رکھ سکتا۔ ان کی سیمابی سرشت انھیں نئے نئے مرکز تلاش کرنے کی دھن میں لگائے رکھتی ہے۔ ایک ہی غزل کے متعدد اشعار میں خیالی تضاد حیرت کا مقام نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال کہ اصلی مزاج کی وہ عکاسی ہے جو تکلف اور تصنع سے پاک ہے۔

سوز جسے اثر کی روح سمجھا جاتا ہے، غزل کی جان ہے اس کی قوت تاثیر سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب اگر شعراء اس کی شعری کرشمہ سازیوں کو روبہ عمل نہ لائیں تو یہ نقص صنفِ غزل کا نہیں ہو سکتا۔ نام نہاد شاعروں کی کمی کبھی نہیں رہی اس کے بھرم کے مٹ جانے کی ذمہ داری انھی کے سر ہے۔

غزل جس زمانے کی پیداوار ہے اول تو اس زمانے میں حالات اس قسم کے نہ تھے، علاوہ ازیں شاعری اور خطابت کے مدارج بھی الگ الگ تھے۔ شاعر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا اور خطیب دوسروں کے جذبات کو ابھارتا تھا۔ غزل لکھنے والوں کے سامنے زیادہ تر شخصی زندگی کا ایک ہی سوال رہا کرتا تھا کہ ہوا کیا؟۔ ہے کیا؟ اور ہوگا کیا؟ ان چیزوں سے انھیں بہت کم بحث رہا کرتی تھی۔ غزل صرف دو قوتوں کی پرورش کرتی تھی، قوت حس اور قوت ادراک، قوت ارادی کی پرورش اس نے کی بھی تو اس طرح کہ اسے بمنزلہ نہ کرنے کے کہا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ تینوں قوتیں شعور کے اجزاء ترکیبی سے ہیں، ادب کو ان سب کی نشو ونما کرنی چاہیئے۔ ہر قوم کا ادب اس کے جمود اور بیداری کی تصویر انھی اندازوں پر ہوا کرتا ہے۔

آج غزل اپنے لکھنے والوں سے تکمیل کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اب یہ روایتی خیالات کا آئینہ نہیں رہ سکتی۔ اسے بھی وہ رنگ اختیار کرنا پڑیگا جس میں مختلف حقیقتوں کی جھلک ہو۔ پرانی بندشوں کو توڑ کر اسے اس کے موجودہ مقام سے آگے بڑھانا ہوگا تاکہ اس کے لطیف مزاج اور سحر کارانہ رمزیت کے جوہر منظر عام پر آسکیں۔ اسے افادیت سے بے بہرہ نہیں رکھا جا سکتا۔ شعر و ادب عالی دماغوں کی متحدہ سرگرمیوں کا ثمرہ ہے اس کے

نقائص کا ازالہ بھی متفقہ کوششوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ اگر افراط اور
تفریط کی سطح سے ہٹ کر کچھ سوچا جائے تو یقیناً کوئی نہ کوئی مفید حل
نکل سکتا ہے۔ شعر و ادب ملک کا مشترک سرمایہ ہے اس کا ہر نقصان
ملکی نقصان ہے۔ فقط

یعقوب عثمانی
۱۴/۴ ۵۷ء

مرحلے

(نظمیں)

سکوتِ دیدہ حیرت فروز شاہد ہے
تلاشِ زیست میں کن مرحلوں سے گذرا ہوں
یعقوب عثمانی

کیفِ عنوان

میں

دستِ احساس میں ہے ساغرِ عرفانِ حیات
چشمِ ادراک میں ہے رنگِ گلستانِ حیات
قلبِ مدہوشِ ترنم ہے غزلخوانِ حیات
ذوقِ سرشارِ تکلّم ہے سخندانِ حیات
جوششِ امیدِ فراواں ہے نگہبانِ حیات
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے طوفانِ حیات

خوابِ ہستی کو حقیقت سے بدلنا ہے مجھے
کلفتِ دہر کو راحت سے بدلنا ہے مجھے

ہمت افروز ہے گلہائے تمنّا کا نکھار
حکمت آموز ہے امیدِ مسلسل کا وقار
خاک روکے گا نگاہوں کو بلاؤں کا حصار
ذوقِ خوش فکر ہے اور آئینۂ صبح بہار
باغِ فردوس ہے گلزارِ تخیّل پہ نثار
غنچہ غنچہ نظر آتا ہے گلستاں بہ کنار
میری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
دامنِ دل میں عقیدت کے سوا کچھ بھی نہیں
دشمنِ فکر و نظر، لذت و راحت کے غلام
تیری ہر سعیِ ہوس رہتی ہے سعیِ ناکام
کوئی آغاز نہیں تیرا مسرت انجام
زندگی تو جسے سمجھا ہے وہ ہے حبس دوام
تیری ہر صبحِ تجلی ہے ستم خوردۂ شام
تو نے دیکھا ہی نہیں آئینۂ حسنِ تمام
حسن در پردہ نہاں میری ہر افتاد میں ہے
غم میں ہے، درد میں ہے، فکر میں ہے، یاد میں ہے

مجھ کو فطرت سے ملی ہے نگۂ جلوہ نگر
رشکِ فردوس بریں ہے مرا فردوسِ نظر
ضو فگن شمعِ محبت ہے سیہ بختی پر
خندہ زن شدتِ غم پر ہے مری شام و سحر
فکر آغاز کی ہے مجھ کو نہ انجام کا ڈر
میری کوشش نہیں دریوزہ گرِ بابِ اثر

تشنہ کامی بھی میری کیف کا اک عالم ہے
جامِ افکار مرا غیرتِ جامِ جم ہے

میری دنیائے طلب کا ہے نرالا دستور
احتیاج آکے بڑھا جاتی ہے پندارِ شعور
التجا جرأتِ رندانہ سے رہتی ہے دور
فاقہ مستی میں بھی مٹتا نہیں ہمت کا غرور
میرے ارمان ہیں مجبور نہ میں ہوں مجبور
ڈھونڈھ لیتا ہوں میں کھوئی ہوئی امید کا نور

جب کبھی منتِ اغیار کا آتا ہے سوال
توڑ دی جاتی ہے مہرِ خمِ صہبائے خیال

مارچ سنہ ۴۹ء

اِنسان

یہی کیا کم زبانِ حال پر ماضی کا احساں ہے
زمانے کی خموشی واقفِ تاریخِ انساں ہے
سراپا آدمیت کا نظر سے لاکھ پنہاں ہے
نہاں خانے میں احساسات کے لیکن نمایاں ہے
خیالِ آدمیت آج بھی عظمت بداماں ہے
عناصر کا یہ مجموعہ، عبارت جس سے انساں ہے
ضیائے حُسنِ فطرت ہے، چراغِ بزمِ امکاں ہے
شمیمِ گلشنِ ایجاد ہے، روحِ گلستاں ہے
جہانِ رنگ و بو میں حاصلِ فصلِ بہاراں ہے
یہ وہ پیکر ہے خود پیکر تراشی جس پہ نازاں ہے

اسی نے بھر دیا ہے سوز سے ویرانۂ دل کو
اسی نے گُر محبت کے سکھائے ہیں عنادل کو
بنایا ہے اِسی نے آ کے منزل، نقشِ منزل کو
اُبھارا ہے اِسی نے جستجو کے ذوقِ کامل کو

اسی کی تشنہ کامی سے فروغِ جامِ عرفاں ہے

فنا کا حرفِ مطلب ہے یہ، تفسیرِ بقا ہے یہ
ازل کی انتہا ہے یہ، ابد کی ابتدا ہے یہ
مجسم سعی ہے، روحِ روانِ ارتقا ہے یہ
تلاشِ خیر و شر میں آپ اپنا مدعا ہے یہ

نگاہِ آرزو اس کی نگاہِ جلوہ ساماں ہے

نظر اس کی، خیال اس کا، غیاب اس کا، حضور اس کا
یقین اس کا، گماں اس کا، خفا اس کا، ظہور اس کا
عدم اس کا، وجود اس کا، ہر اک نزدیک و دور اس کا
یہی یہ ہے اگر بیدار ہو جائے شعور اس کا

کتابِ دہر کا مشکل سے مشکل تر یہ عنواں ہے

یہ اپنی مستقل تاریخ اپنے ساتھ لاتا ہے
جہانِ آب و گلِ کے ذرّے ذرّے کو سناتا ہے
یہی آتا ہے اور ماضی و مستقبل بناتا ہے
زمانہ بن کے آتا ہے زمانہ بن کے جاتا ہے
اسی کی رہنمائی میں رواں عمرِ گریزاں ہے

یہ چاہے تو فنا کر دے حیاتِ سرمدی اپنی
یہ چاہے تو بنا لے موت کو بھی زندگی اپنی
نہ مٹنے دے اگر یہ لذتِ خود آگہی اپنی
فسانہ ہے یہی اپنا، حقیقت ہے یہی اپنی
یہ خلوت گاہِ قدرت کا چراغِ زیرِ داماں ہے

جون ۴۹ء

جائزہ

مناجاتِ قلب و جگر سن رہا ہوں
بیاناتِ فکر و نظر سن رہا ہوں

نگاہوں میں ہے منظرِ حال و ماضی
حکایاتِ شام و سحر سن رہا ہوں

سراپا نظر ہوں، مجسم توجہ
نوا سنجیٔ بحر و بر سن رہا ہوں

تقاضوں کی گتھی کو سلجھا چکا ہوں
خیالات کا جائزہ لے رہا ہوں

ہم آہنگِ ذوقِ طلب ہے مرا دل
عمل آشنا ہے مرا عزم کامل

شناور ہوں میں چشمۂ زندگی کا
مجھے روک سکتے ہیں دریا نہ ساحل

میں آزاد ہوں قیدِ واماندگی سے
اشارہ بھی کر دوں تو کھنچ آئے منزل

مگر فکر سے پھر بھی الجھا ہوا ہوں
میں احساس کا جائزہ لے رہا ہوں

کدھر ہیں رفیقانِ کج رو کدھر ہیں — ابھی تک یہ منت کشِ راہبر ہیں
کوئی حد بھی ہے آخر اس بے حسی کی — نہ منزل طلب ہیں نہ منزل نگر ہیں
انھیں چھوڑ کر کیسے آگے بڑھوں میں — یہ سب ناشناسانِ ذوقِ سفر ہیں

نظر جادے جادے پہ دوڑا چکا ہوں
میں حالات کا جائزہ لے رہا ہوں

خرد میرے مقصد کو پائے نہ پائے — جنوں کو مرا طرز بھائے نہ بھائے
بہ ایں لرزشِ دل بھی میں مطمئن ہوں — زمانہ مسرت کو لائے نہ لائے
مری منتظر ہے رہِ کامرانی — یقیں نامرادی کو آئے نہ آئے

نتائج سے نزدیک تر آ چکا ہوں
ہر امکان کا جائزہ لے رہا ہوں

جولائی ۵۱ء

سوال

پناہوں میں رہ کر سہاروں میں رہ کر
اداؤں میں رہ کر اشاروں میں رہ کر
فسوں کار جادو نگاروں میں رہ کر
ضیا بار محمل سواروں میں رہ کر
نظر باز ارماں شعاروں میں رہ کر
ارم ساز ایماں شکاروں میں رہ کر
ترانہ بہ لب گلعذاروں میں رہ کر
تماشا بہ رخ ناہ پاروں میں رہ کر

ہوئی کس سے بدظن خوشی زندگی کی؟

یمینوں سے بچ کر یساروں سے بچ کر
شکیبوں سے بچ کر قراروں سے بچ کر
مسلسل منظم قطاروں سے بچ کر
مکمل مجسّم بہاروں سے بچ کر

روپہلے سنہرے حصاروں سے بچ کر
چمکتے دمکتے ستاروں سے بچ کر
لجائے ہوئے دام داروں سے بچ کر
نہائے ہوئے مرغزاروں سے بچ کر
کدھر چل بسی ہے خوشی زندگی کی ؟

جنازوں سے ڈر کر مزاروں سے ڈر کر
عذابوں سے ڈر کر فشاروں سے ڈر کر
شقاوت سپر شہریاروں سے ڈر کر
رعونت بسر تاجداروں سے ڈر کر
الم کوش عظمت مداروں سے ڈر کر
اماں پوش گردوں وقاروں سے ڈر کر
خطا کار آمر نگاروں سے ڈر کر
جفا کار پروردگاروں سے ڈر کر
کہاں جا چھپی ہے خوشی زندگی کی ؟

اپریل ۵۲ء

یاد

ضو فگن ذوقِ خوشنوائی ہے
وقت رہ رہ کے گنگناتا ہے
وجد میں جھوم اٹھی ہے لیلئ فن
نور ہی نور ہے ہواؤں میں
چپہ چپہ ہے گلستاں منظر
بس گئی ہے نفس نفس میں خوشی
ہر تخیل بہشت ساماں ہے
آرزو آرزو ہے جلوہ نگر
حوصلوں میں ہے شانِ برنائی
شوق نے ڈھونڈ لی رہِ تجدید
نقشِ احساسِ نو، بہار پہ ہے
یاد مصروفِ خود نمائی ہے

جوشش زن عزمِ لب کشائی ہے
کیف آ آ کے لئے ملاتا ہے
موجِ نغمہ ہے دل کی ہر دھڑکن
حسن ہی حسن ہے فضاؤں میں
ذرہ ذرہ ہے یاسمیں پیکر
دوش کا غم نہ فکرِ فردا کی
ہر تصور یقیں بداماں ہے
رشتۂ کہکشاں ہے تارِ نظر
ولولے لے رہے ہیں انگڑائی
لے کے نکلا ہے مشعلِ امید
چہرۂ مدعا نکھار پہ ہے
زندگی خواب بن کے آئی ہے

حاصلِ دل سپردگی ہوتے
کاش یہ لمحے دائمی ہوتے

اکتوبر سنہ ۴۹ء

التجا

بڑھا نہ بزم تمنّا کا اعتبار ابھی
نظارہ سوز ہے نیرنگِ روزگار ابھی

لہو اگلتی ہے صرصر شفق کے دامن پر
فضا فضا ہے ستم خوردۂ بہار ابھی

ہلاکِ شیوۂ بیداد ہے اُمنگ اُمنگ
اسیرِ جبر ہے ایک ایک اختیار ابھی

خوشی خوشی کا گلا گھونٹ دیتی ہیں آہیں
اذیتوں کو تبسم ہے ناگوار ابھی

نفس نفس پہ سراسیمگی کا قبضہ ہے
نگاہِ وقت ہے ناواقفِ قرار ابھی

یقیں یقیں متفکر، گماں گماں بیتاب
بنے ہوئے ہیں حوادث گلے کا ہار ابھی

کہاں کا حسنِ تماشا کہاں کی لذتِ دید
نظر کو روتی ہے خود چشمِ انتظار ابھی

حیات خواب ہے، دورِ حیات افسانہ
فقط امید پہ ہے زیست کا مدار ابھی

تلاش کرنی ہے روحِ شگفتگی مجھکو
حقیقتوں میں سمونی ہے زندگی مجھکو

نہ دے پیامِ سکوں اے خیالِ یار ابھی

جنوری سنہ ۵۳ء

جھنڈا

زہے پیمانِ آزادی، خوشا اعلانِ آزادی

ہوا اٹھکھیلیاں کرتی ہے کلیاں مسکراتی ہیں
مناظر جاگ اُٹھے ہیں فضائیں گنگناتی ہیں
تمنّاؤں کو امیدیں پھر آئینہ دکھاتی ہیں

وفورِ کیف میں تفریقِ روز و شب کی مشکل ہے
جہانِ جستجو کا ذرّہ ذرّہ شمعِ محفل ہے
ضیائے بزمِ انجم رہنمائے صبحِ منزل ہے

نظر افروز موج اُٹھتی ہے جامِ زندگانی سے
مئے گل گوں برستی ہے فضائے آسمانی سے
اُمنگیں مطمئن ہیں آج رنگِ شادمانی سے

سکوں پرور گھٹا امن و اماں کی چھائی جاتی ہے
زمین و آسماں پر خامشی سی چھائی جاتی ہے
زمانے پر شباب افروز مستی چھائی جاتی ہے

جوانی کھیلنے آئی ہے ارمانوں کی دنیا میں
شمیمِ زندگی پھیلی ہے بے جانوں کی دنیا میں
حقیقت نے جگہ پائی ہے افسانوں کی دنیا میں

سفیرِ وقت پیغامِ سحر دینے کو آیا ہے
نویدِ خندۂ لذت اثر دینے کو آیا ہے
حیاتِ نو، حیاتِ معتبر دینے کو آیا ہے

مسرّت خیمہ زن ہو جائیگی اب صحنِ گلشن میں
بہار انگڑائیاں لے گی گلوں کے چاک دامن میں
عنادل کل سے اپنی نیند سوئیں گے نشیمن میں

خزاں لے پھر سے کھولے جا رہے ہیں رنگ و نکہت کے
بدلنے ہی پہ ہیں آئین زندانِ سیاست کے
اسیر دسوچنے کیا ہو، پڑھا دو طوقِ منت کے

بجا ہوں تیرے دعوے کاش اے فیضانِ آزادی

اگست سنہ ۴۷ء

اندھیر

ایں گلِ دیگر شگفت اے کاوشِ صبر آزما
بر لبطِ افکار سے آتی ہے ماتم کی صدا
جھک گئی ہے فرطِ غیرت سے نگاہِ مدعا
ایک جلوہ بھی نہیں ملتا ہے منظر آشنا
کیا ہوا اے دورِ بیداری وہ تیرا ادعا
ہر سحر لاتی ہے اپنے ساتھ تازہ حادثا

دامنِ دوشیزۂ امن اور اتنا تار تار
ہائے یہ کشتوں کے پشتے اور یہ فصلِ بہار

برقِ راحت سوز ہے تنویرِ شمعِ انجمن
تیغ خوں آشام ہے رنگینیٔ صبحِ چمن
تازگی کی روح سے آنے لگی بوئے کفن
خرّمی کے جسم پر ہے بیکسی کا پیرہن
لے اُڑی ہے تلخ کامی لذتِ کام و دہن
ہمت افزا کامرانی بن گئی ہمت شکن

الحذر اے عافیت دشمن تغیر الحذر
ہوگیا سارا جہاں خیر و شر زیر و زبر

آسماں چکر میں ہے نیرنگِ صبح و شام سے
وقت گھبرایا ہوا ہے گردشِ ایام سے
دہلے جاتے ہیں حوادث کثرتِ آلام سے
سہمے جاتے ہیں مصائب ہیبتِ انجام سے
کانپ اٹھا ہے قلبِ گیتی اضطرابِ عام سے
تھم گئی ہے نبضِ ہستی حشرِ بے ہنگام سے

موت کی زد میں حیاتِ جاوداں آنے کو ہے
نظم و ضبطِ عالمِ امکاں بدل جانے کو ہے

دستِ ارماں شل ہے، چشمِ شوق پتھرائی ہوئی
سرنگوں تدبیر ہے، قسمت ہے چکرائی ہوئی
جسم تھرائے ہوئے ہیں، روح گھبرائی ہوئی
جی ہی جی میں کڑھ رہی ہے زندگی آئی ہوئی
ظلم کی روندی ہوئی، نخوت کی ٹھکرائی ہوئی
آدمیت دور جا بیٹھی ہے شرمائی ہوئی

دوستی ہے وقفِ کارِ دشمنی، اندھیر ہے
جس طرف دیکھو اُدھر اندھیر ہی اندھیر ہے

سوچتی کیا ہے بتا اے جرأتِ عنقا شکار
بحر و بر پر آج کیا تیرا نہیں ہے اختیار
عصرِ حاضر کی فضائیں بد سے بدتر ہوں ہزار
تو لٹا سکتی ہے اب بھی دولتِ صبحِ بہار
تو بڑھا سکتی ہے اب بھی زندگی کا اعتبار
تو بدل سکتی ہے اب بھی نقشۂ لیل و نہار

امنِ عالم کے لئے کوئی نظامِ نو بنا
موڑ بھی دے بڑھ کے، دھارا نکیتِ اغراض کا

اکتوبر ۴۷ء

زمزمہ

بناؤ ہے سنگار ہے — سجاؤ ہے نکھار ہے
شجر شجر کلی کلی — نگارِ فتنہ کار ہے
شمیم عطر بیز ہے — نسیم مشکبار ہے
اُمنگ ہے ترنگ ہے — سکون ہے قرار ہے

شباب پر بہار ہے

چلی ہوائے صبحدم — چمن ہے غیرتِ ارم
صباحتیں روش روش — نزاکتیں قدم قدم
ٹپک رہا ہے رنگِ مے — فضا ہے رشکِ جامِ جم
گماں تو یہ غلط نہیں — مگر حضورِ محترم

بہار پھر بہار ہے

کسے رِجھا رہے ہیں اب — کسے لبھا رہے ہیں اب
سکونِ دل سے آشنا — کسے بنا رہے ہیں اب
یہ سبز باغِ عافیت — کسے دکھا رہے ہیں اب
یہ داستانِ مصلحت — کسے سنا رہے ہیں اب

حقیقت آشکار ہے

مصیبتیں ، فلاکتیں — صعوبتیں ، اذیتیں
بپا ہیں گوشے گوشے میں — نئی نئی قیامتیں
سبھی کو آتی ہیں نظر — کھلی ہوئی حقیقتیں
سراہیں گی کسے کسے — زبان کی طلاقتیں

بہار شرمسار ہے

مٹا کے جوہرِ نمو — گھٹا کے جوشِ آرزو
جلا کے حوصلوں کا دل — بہا کے ضبط کا لہو
کہاں کہاں جمائیے گا — بیان ، رنگِ گفتگو
نہ چھیڑئیے نہ چھیڑئیے — فسانہ ہائے رنگ و بو

ابھی کہاں بہار ہے

کجا خلش ، کجا طرب — کجا سکوں ، کجا تعب
چمن کو اب نہ چاہیے — نمود و نامِ تاب و تب
نہ چل سکے گا وقت اب — جناب کا طلسم اب
بہار کے ہیں منتظر — تغیراتِ روز و شب

یہ دورِ انتظار ہے

جنوری سنہ ۴۹ء

احساس

ایک معدوم سی ضو، چند فسردہ سے شہاب
ایک موہوم سی رو، چند شکستہ سے حباب
ایک فرسودہ سی لے، چند پریشاں سے بیاں
ایک گم کردہ سی شے، چند نمایاں سے نشاں
ایک مٹتا سا بھرم، چند گھٹی سی آہیں
ایک بڑھتا سا قدم، چند مڑی سی راہیں
ایک حاصل سازیاں، چند گریزاں سے قصور
ایک باطل سا گماں، چند پشیماں سے غرور
ایک ہلکی سی کھٹک، چند الجھتے سے سوال
ایک میٹھی سی کسک، چند بھٹکتے سے خیال
تو ہی سمجھا دے مجھے اے مرے دیرِ وزِ خیال
کیا اسی کاوشِ مبہم کو میں سمجھوں احساس

ایک بے نور فضا ، لاکھ فریبوں کے حصار
ایک مجبور دعا ، لاکھ نصیبوں کے مزار
ایک امکانِ سحر ، لاکھ شب افروز آثار
ایک دامانِ نظر ، لاکھ سکوں سوز شرار
ایک امیدِ حزیں ، لاکھ ستم کیش افکار
ایک تائیدِ یقیں ، لاکھ بد اندیش انکار
ایک خوں گشتہ خوشی ، لاکھ بپھرتی لہریں
ایک سر بستہ کمی ، لاکھ ٹھہرتی نبضیں
ایک سیلابِ وبا ، لاکھ تڑپتے ہوئے صبر
ایک گردابِ قضا ، لاکھ جھپٹتے ہوئے حشر
تو ہی سمجھا دے مجھے اے مرے امروزِ حیات
کیا اسی شورشِ پیہم کو میں سمجھوں احساس

ایک پر وردہ امنگ ، ایک خیالی نغمہ
ایک آوردہ ترنگ ، ایک خیالی صہبا
ایک آزردہ بہار ، ایک خیالی نزہت
ایک پژمردہ قرار ، ایک خیالی جنّت
ایک برباد ثبات ، ایک خیالی احیا
ایک ناشاد حیات ، ایک خیالی فردا
ایک آشفتہ سماں ، ایک خیالی زینت
ایک افسردہ جہاں ، ایک خیالی راحت
ایک نادیدہ فلک ، ایک خیالی محور
ایک پوشیدہ چمک ، ایک خیالی خاور

تو ہی سمجھا دے مجھے اے مری فردائے امید
کیا اسی تابشِ مبہم کو میں سمجھوں احساس

دسمبر ۵۲ء

عزم

اے خوشا ولولۂ عزم و خوشا جوش و خروش
بار ہے ضبط کی ہمت پہ خیالِ غم دوش
لرزشِ دل میں ہے تاثیرِ نواہائے سروش
ہوگئے ہیں لبِ فریاد و شکایت خاموش
بیلئ جرأتِ بیباک ہوئی جلوہ فروش
ہوگیا شوق سے معمورِ نظر کا آغوش
اب وہ طوفاں ہو خوشی کا کہ امنگوں کا ہو جوش
غم کے پردے میں کوئی رہ نہ سکے گا روپوش
یاس انگیز ہوائیں سہی غم خانے کی
شمع جلنے کو ہے امید کے کاشانے کی
ہوش کے زیرِ اثر کیف کی دنیا نہ سہی
دولتِ عیش پہ احساس کا قبضا نہ سہی
غیرتِ باغِ ارم باغِ تمنا نہ سہی
چشمِ نظارہ طلب محوِ تماشا نہ سہی

تلخئ بادۂ امروز گوارا نہ سہی
جام ادراک میں رنگِ مئے فردا نہ سہی
کاوشِ ناخنِ غم کاوشِ بیجا نہ سہی
نہیں باقی کوئی جینے کا سہارا نہ سہی
جذبۂ شوق سلامت ہے تو پھر بسم اللہ
کوئی طاقت نہیں کر سکتی سفینے کو تباہ

سعئ پیہم کو اثر اپنا دکھانا ہوگا
رنگِ آہِ دلِ خوں گشتہ جمانا ہوگا
منزلِ شوق پہ خود یاس کو لانا ہوگا
حوصلہ چشم تمنا کا بڑھانا ہوگا
عکسِ تصویرِ خیالی کو مٹانا ہوگا
مرکزِ دیدہ و دل ایک بنانا ہوگا
مژدۂ عیشِ خوش انجام سنانا ہوگا
پھر سے سوئی ہوئی قسمت کو جگانا ہوگا
لاکھ دشمن سہی برگشتہ مقدر کی نظر
ناز تدبیر کو ہے عزم کے بل بوتے پر

جنوری ۴۸ء

گلبانگ

بیباک آرزو کی اللہ ری طرفہ کاری
نغموں میں ڈھال دی ہے آوازِ آہ وزاری
نظروں میں آسمایا رنگِ سکوں نکھر کر
دنیا بدل گیا ہے نقشِ خیال اُبھر کر
تھے ہی نہیں فضا پر غم کے سحاب جیسے
آنکھوں میں پھر رہا ہے ایک ایک خواب جیسے

دامن ہے پارہ پارہ احساسِ کہنگی کا
زینت دہِ زمیں ہے تعمیرِ نو کا نقشا
جھلسے ہوئے خیاباں پھر جگمگا اٹھے ہیں
سہمے ہوئے سخنداں پھر گنگنا اُٹھے ہیں
سازِ حیات لے کر آگے بڑھا زمانہ
خاموشیوں نے چھیڑا پھر سے نیا ترانہ
آغوش میں فضا کے نکہت مچل رہی ہے
دوشیزۂ تمنا کروٹ بدل رہی ہے

ہر سمت کھل گئی ہیں نزہت کی شاہراہیں
معمورِ نور سے ہیں ترسی ہوئی نگاہیں
سیرابیٔ نظر کا ہنگام آگیا ہے
رنگینیوں کا عالم ترتیب پا گیا ہے
دکھلا دیئے زمیں نے جوشِ نمو کے جوہر
شکنیں سی پڑ گئی ہیں پیشانیٔ فلک پر
ناکام ہو چکی ہے تدبیر آسماں کی
تفریق مٹ گئی ہے صحرا و گلستاں کی
جلووں میں روحِ تازہ بھر دی ہے زندگی نے
سکہ جما دیا ہے ذروں کا روشنی نے

کیوں جان کھو رہی ہے اے تشنہ کام شبنم
صحنِ چمن میں ہوگا تیرا بھی ایک عالم
ذوقِ یقینِ محکم فردا کا رازداں ہے
امید کی نظر میں جو چیز ہے جواں ہے
رکھ دینگے اک نہ اک دن جنت زمیں پہ لا کے
یہ سرخ سرخ بوٹے دامانِ ارتقا کے
جولائی ۵۰ء

اکتوبر سنہ ۴۹ء

روح پھونکی ہے عقیدت نے پرستاروں میں
دھوم ہے بادۂ امید کی مے خواروں میں
مئے دستورِ کہن ہو گئی پانی پانی
قیمتِ جامِ ہوس گر گئی ناداروں میں
توڑ دی وقت نے مہرِ خمِ مشرق آکر
تیرہ و تار فضائیں ہیں ضیا باروں میں
چھپ گیا پردۂ زنگاریٔ شب کا منظر
اب ثوابت میں ہے وہ بات نہ سیاروں میں
چہرۂ یاس پہ غلطاں ہے شعاعِ امید
جلوہ گر شاہدِ اقرار ہے انکاروں میں
ضبط کو ناز ہے فطرت کی سکوں زائی پر
صلح کی شکل نظر آتی ہے پیکاروں میں

رزمِ امروز ہے آئینۂ بزمِ فردا
نغمے روش ہیں تلوار کی جھنکاروں میں
ذرے ذرے سے جھلکتی ہے شفق کی سرخی
لالہ کاری ہے نئے طرز کی گلزاروں میں
جلوہ جلوہ نظر آتا ہے ارادت بہ کنار
غنچہ غنچہ ہے مئے شوق کے سرشاروں میں
کھوئے کھوئے سے ہیں لمحاتِ قیامت آثار
آمدِ صبحِ خوش انجام ہے بیداروں میں
نقصِ احساس نے جس ذوق کی ڈھادی تھی بنا
آج تکمیل ہے اس ذوق کے معماروں میں

اکتوبر ۴۹ء

لمحاتِ فکر

وہ شب کی تیرگی ہے نہ سرخی شہاب کی
وہ غم کی ہوک ہے نہ خلش اضطراب کی
رشکِ فضائے صبحِ چمن ہے فضائے شوق
"پھوٹی ہے داغِ دل سے کرن آفتاب کی"

ویرانیوں پہ منظرِ دلکش بنا دیئے
دم بھر میں رنگ و نور کے دریا بہا دیئے
موڑی عنانِ کیف کچھ اس آن بان سے
طوفانِ حشر خیز کے چھکے چھڑا دیئے

احساس آئینہ ہے شکیب و قرار کا
منہ تک رہا ہے جبر کھڑا اختیار کا
دم توڑ توڑ دیتے ہیں آ آ کے وسوسے
دیوارِ آہنی ہے حصار اعتبار کا

فکرِ رسا ہے رفعتِ افلاک کا جواب
چل دی ہے پست حوصلگی کھا کے پیچ و تاب
جذبات نے اڑا دیئے پرچم امید کے
لشکر ہے ولولوں کا تخیل کے ہم رکاب

تاثیر دھو رہی ہے کثافت زبان کی
پھولے نہیں سماتی ہے جرأت بیان کی
ذوقِ سخن پہ حسن فدا ہے یقین کا
ہیبت سے چھوٹی جاتی ہیں نبضیں گمان کی

ناکامیوں سے کوششِ دیرینہ دور ہے
ہر ہر نفس مرقعِ فرطِ سرور ہے
لمحاتِ فکرِ شعر کا اللہ رے اہتمام
میری نظر نظر میں تبسم کا نور ہے

دشمن ہوں میرے نوحہ گرِ دل شکستگی
پروا نہیں ہے آج بھی آشوبِ دہر کی
فطرت سناتی رہتی ہے مجھکو یہی پیام
ڈھل جائیگی کبھی اِنھی سانچوں میں زندگی

مارچ سنہ ۵۳ء

سہرا ہے

جوشِ تمنا کی بن آئی
برقِ مسرت پھر لہرائی

سینہ و دل میں حشر بپا ہے
ذوقِ تماشا چونک پڑا ہے

اوجِ فلک پر پائے نظر ہے
رو کشِ منزل راہ گذر ہے

نور پہ ظلمت قہقہہ زن ہے
شام جوابِ صبحِ چمن ہے

چاند اتر آیا ہے زمیں پر
شعر و شباب کا پیکر بن کر

قامتِ رعنا سروِ خراماں
عارضِ تاباں مہرِ درخشاں

سحرِ مجسّم صورتِ زیبا
حُسن کا عالم رنگ کی دنیا

روحِ لطافت، جوہرِ صہبا
تابشِ جلوہ کیفِ سراپا

چشمِ حیا میں سرمۂ عصمت
طرزِ نظر میں شوخیٔ فطرت

رعبِ متانت غرقِ تبسّم
شانِ خموشی جانِ تکلّم

موجِ نفس سے گرد معطّر
پرتوِ رخ سے راہ منوّر

پھونک دیا رفتار نے افسوں — گردش بھول گیا ہے گردوں
رو میں ہوا کی زیر و بم ہے — نغمہ سرا ہر نقشِ قدم ہے
محوِ ترنم ساری فضا ہے — وقفِ نظارا ارض و سما ہے

کچھ تو بتا اے جذبِ محبت
تلخ ہے یا شیریں یہ حقیقت
نازکشِ دل کون ہوا ہے
راہ میں حائل کون ہوا ہے
سوز کا حاصل یہ تو نہیں ہے
اپنی منزل یہ تو نہیں ہے

جون ۵۳ء

اعتماد

عہدِ ماضی کے نہاں خانے میں چھپنے والے
تجھ سے مایوس نہیں ذوقِ تماشا اب بھی
وسوسے آج بھی نزدیک نہیں آ سکتے
دل میں رکھتا ہوں وہی حشرِ تمنا اب بھی
کامرانی ہی کے بدلے ہوئے تیور کی قسم
کامرانی ہی کا گاتا ہوں ترانا اب بھی
وہ مسرت نہ سہی، کیف وہی آج بھی ہے
غم ترا دے نہ سکیگا مجھے دھوکا اب بھی
میں وہی ہوں کہ جو تھا شوق وہی ہے کہ جو تھا
زحمتِ شوق میں بھی ملتی ہے لذت مجھکو
احترامِ نگہِ عزم ہے شیوا میرا
کن اُچٹتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا تھا
آج تک حل نہ ہوا تجھ سے معما میرا

پردہ ہائے حرمِ عیش تو کیا دینگے جواب
پوچھ لے گردشِ افلاک سے رتبا میرا
توڑ لایا ہوں تری نذر کو تارے اے دوست
میرے احساس کی تصویر ہے نغما میرا
نامرادی کا نہ پہلے تھا نہ اب ہے شکوا
پہلو پہلو ہے زمانے کا نظر میں میری
آرزو جس کی ہے وہ وقت بھی آجائے گا
دورِ نو چھیڑے گا جب سازِ خموشِ ارماں
بختِ خوابیدہ کو بیدار کیا جائے گا
کلفتِ زیست کی راحت سے تلافی ہوگی
دامنِ صبر مسرت سے بھرا جائے گا
ہر نفس، جذبِ محبت کا پیامی ہوگا
حسن خود آکے نگاہوں میں سما جائے گا
میرا امروز ہے آئینۂ شکلِ فردا
جون ۵۳ء

امروز سے......

اے خردِ شکارِ امروز پاسبانِ تاریکی
تیرا لمحہ لمحہ ہے ترجمانِ تاریکی
فتنہ فتنہ ہے غمّاز تیری حیلہ سازی کا
تو نیا مرقع ہے حادثاتِ ماضی کا
مرکزِ نظر تیرا خرمنِ روایت ہے
ماخذِ یقیں تیرا مخزنِ حکایت ہے
تو نے دی ہوا ایسی دامنِ سیاست کی
شمع بجھ گئی آخر بزمِ آدمیّت کی
امن سر بہ زانو ہے پھنس کے تیرے گھیرے میں
راہ بھول بیٹھی ہے آشتی اندھیرے میں
حیرتوں کا قبضہ ہے چشم و دل کی دنیا پر
حکمراں خموشی ہے کشورِ تمنّا پر

عقل ہی کی دشمن ہیں عقل زاد تدبیریں
پائے آگہی میں ہیں وسوسوں کی زنجیریں
ذہن کو نہیں ملتی شاہراہِ بیداری
فکر پر مسلّط ہے شحنۂ گراں باری
نکتہ چینی کرتا ہے تیرے حسنِ نیت پر
جو بھی نقش اُبھرتا ہے پردۂ بصارت پر
تیری تیرہ روزی کا شاہکار عبرت ہے
تیری سخت کوشی کا مدعا قیامت ہے
دھاک تو بٹھا دی ہے تو نے جورِ بیجا کی
کچھ خبر بھی ہے لیکن تجھ کو اپنے فردا کی
کل بدل کے چھوڑے گی زندگی نظام اپنا
جرأتوں کو اُکسا کر لے گی انتقام اپنا

فروری ۱۹۵۳ء

تمنّا

حریمِ تخیل کی شمعِ فروزاں
خیابانِ احساس کی صبحِ خنداں
طرب ریز، گل بیز، آئینہ ساماں
مسرت بہ آغوش، گلشن بداماں

زمان و مکاں میں تری روشنی ہے
ترے دم سے یہ زندگی، زندگی ہے

نگاہوں پہ ہے عالمِ ہوش طاری
ارادوں میں ہے سطوتِ استواری
گھٹا خود بخود زورِ غفلت شعاری
ترے جوش کا فیض ہے فیضِ جاری

ابلتی ہے دل میں مئے زندگانی
اچھلتا ہے نبضوں میں خونِ جوانی

ترا سوز سرمایۂ دل کشی ہے
ترے غم کا حاصل خوشی ہی خوشی ہے
ترا درد سرچشمۂ آگہی ہے
تری ہر کھٹک دشمنِ بےبسی ہے

امنگیں اٹھیں پا کے تیرا اشارا
امیدیں بڑھیں لے کے تیرا سہارا

خوشا دلفریبئ امیدِ مبہم
بنی جا رہی ہے یقینِ مجسّم
زہے طرفہ کاریٔ عزمِ مصمم
ہوا ربطِ فکر و عمل ربطِ محکم

ترے در سے انساں نے کیا کچھ نہ پایا
محالات کو تو نے ممکن بنایا

اُداسی کی چھا جاتی ہیں جب گھٹائیں
مخالف چلا کرتی ہیں جب ہوائیں
بھیانک نظر آتی ہیں جب فضائیں
سراسیمہ ہو جاتی ہیں جب دعائیں

بہ آں خستہ حالی بہ آں جوشِ حرماں
تری یاد رہتی ہے دل کی نگہباں

نشاط آفرینا، شباب آفرینا
ترے بس میں ہے زندگی کا سفینا
سراپا کرم ہے تری چشمِ بینا
سکھاتی ہے دنیا کو مر مر کے جینا

ترا کیف، کیفِ بہشتِ بریں ہے
تری موج، موجِ حیات آفریں ہے

خموشی تری رنگ و بو کا خزانہ
تکلّم ترا زندگی کا ترانہ
نہ ہوگا کبھی ختم تیرا فسانہ
بدلنے کو بدلا کرے گا زمانہ

ابد تک رہیگی جواں تیری دنیا
شبابِ مجسم ہے تو اے تمنّا

فروری ۴۹ء

مکافات

آرزو ضبط کے آغوش میں پلتی کب تک
بربطِ غم کی صداؤں سے بہلتی کب تک
آئینہ دارِ صداقت تھی ضیائے رخِ شوق
کس مپرسی کی زباں زہر اگلتی کب تک
پست اب اتنی بھی نہ تھی جرأتِ چشمِ امید
کروٹیں خوف کے بستر پہ بدلتی کب تک
لاکھ دشمن سہی ماحول کی تاریک فضا
رعبِ ناکامی سے تدبیر دہلتی کب تک

آگہی قیدِ روایات سے بیزار ہے آج
ذہن افکار پہ دستورِ کہن بار ہے آج
خوابِ فردا نظر آتا ہے حقیقت بہ کنار
ٹوٹتے جاتے ہیں دامِ ہوسِ خام کے تار
لمحے لمحے سے نمایاں ہے اداسی کا اثر
حال نے چھین لیا وقت سے ماضی کا سنگار

ذرے ذرے سے عیاں ہو کے رہا سوزِ حیات
چھا گیا بن کے دھواں، جادۂ عشرت کا غبار
کھل گیا دیدۂ پر نم پہ مسرت کا بھرم
قہقہوں سے نہ دبی شیشۂ دل کی جھنکار

سوزنِ حرص و ہوا لاکھ کرے سعیٔ رفو
رو کے رکتا نہیں اب، نبضِ تمدن کا لہو

کاوشِ ناخنِ غم روح کو تڑپا کے رہی
بزمِ احساس میں بیداری کی رَو آ کے رہی
روشِ نطق ہے سینے کی مسلسل دھڑکن
رازِ فطرت خردِ خفتہ کو سمجھا کے رہی
گام زن راہِ یقیں پر ہے تمنا کا شباب
وسوسوں کو نگہِ حوصلہ ٹھکرا کے رہی
کھینچ ہی ڈالے ارادے نے عمل کے خاکے
بے حسی اپنی سکوں زائی پہ شرما کے رہی
صورتِ نفی پہ رنگِ رخِ اثبات ہے آج
زندگی سرمہ کشِ چشمِ مکافات ہے آج

اکتوبر ۵۲ء

گجر

اے نور کے دلدادہ تجلی کے طلبگار
دیکھ اٹھ کے بدلتے ہوئے حالات کی رفتار

بھولی ہوئی تدبیر سے دور اور بہت دور
روٹھی ہوئی تقدیر سے دور اور بہت دور
کھوئی ہوئی شمشیر سے دور اور بہت دور
جکڑی ہوئی زنجیر سے دور اور بہت دور

کچھ اور ہی نقشہ ہے خیابانِ سحر کا
کچھ اور ہی منشا ہے تگ و تازِ نظر کا
کچھ اور ہی ایما ہے غمِ سحر اثر کا
کچھ اور ہی دعویٰ ہے دلِ جذب نگر کا

رخشندہ ہے خورشید کہ تابندہ ہے دانش
یہ سینۂ مشرق ہے کہ گہوارۂ کاوش
افکار کی بوچھار ہے اسرار کی بارش
ہر سو نظر آتی ہے نئے طرز کی تابش

اللہ رے موجِ نفسِ صبح کا اعجاز
ہر ذرۂ بے نور ہے ارمانوں کا غمّاز
انجام کے چہرے پہ ہے رنگِ رخِ آغاز
آتی ہے لبِ یاس سے امید کی آواز

مٹ جاتی ہے دنیا سے وہ شورش ہو کہ پیکار
وقت آ کے اٹھاتا ہے جب انصاف کی تلوار
اغراض کی ہیبت سے لرزتا نہیں ایثار
آسان کو مل جاتی ہے ہر لذتِ دشوار

خاطر میں نہ لا خطرۂ پروازِ شرر کو
بھر لے گلِ مقصود سے دامانِ نظر کو

اپریل ۱۹۵۱ء

اے نگارِ ارماں

تابندگی عام ہو رہی ہے
ظلمت تہہِ دام ہو رہی ہے

رقصاں ہیں فضاؤں میں شرارے
تیز آتشِ خام ہو رہی ہے

خوں ریز نگاہ آسماں کی
خنجر بہ نیام ہو رہی ہے

گھبرائی ہوئی ہے روحِ بیداد
کوشش ناکام ہو رہی ہے

نخوت کی ہوس فروزِ صہبا
دردِ تہہِ جام ہو رہی ہے

بشاش ہے چہرۂ مکافات
مطلوبِ انام ہو رہی ہے

ایک ایک پکار بیکسی کی
راحت کا پیام ہو رہی ہے

آنکھیں کھول اے نگارِ ارماں
بیداری عام ہو رہی ہے

وہ دیکھ کرن سحر کی پھوٹی
اب رات تمام ہو رہی ہے

دسمبر سنہ ۵۳ء

حاصل

زندگی سے ساز کرنا آگیا
خونِ دل رگ رگ میں بھرنا آگیا
چشم بد دور اے حیات افروز امید
نبضِ ارماں کو ابھرنا آگیا
پھوٹ نکلا تشنہ کامی کا لہو
رنگِ مینا کو نکھرنا آگیا
مٹ گئی بیتابیٔ فکر و نظر
ہر بلندی پر ٹھہرنا آگیا
مدعا کی ہر خیالی شکل کو
پردے پردے پر اترنا آگیا
اب ہوئی تکمیلِ ذوقِ طرفہ کار
سوزِ دل نغموں میں بھرنا آگیا

نقوش

(قطعے)

ثباتِ پائے طلب نے وہ گل کھلائے ہیں
رہِ امید کی وسعت کا آئینہ ہیں نقوش

یعقوب عثمانی

رنگِ نقوش

سترِ دلبراں

لذتِ عیش سے یہ لذتِ غم کم تو نہیں
میرا فردوسِ یقیں جنّتِ آدم تو نہیں
لاکھ ناکام سہی کوششِ دستِ احساس
دامنِ امن مگر دامنِ مریم تو نہیں

۶۵۲ء

کہاں سے تازگی آئے خوشی میں
عفونت آنسوؤں کی ہے ہنسی میں
فضائیں جس سے ہو جائیں معطر
وہ خوشبو بند ہے دل کی کلی میں

۵/۳ ۵۲ء

عناں تابِ دستِ قضا ہو چلے ہیں
مشیّت سے زور آزما ہو چلے ہیں
اب اتنا بھی سرمستِ نخوت نہ بہکیں
خودی سے گذر کر خدا ہو چلے ہیں

۱۶/۳ ۵۲ء

اِترا نہ فتنہ جو ستم کامیاب پر
کب تک رہیگا جور کمالِ شباب پر
پابندِ ماہ و سال نہیں انقلابِ وقت
آتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب پر

۲۷/۳ ۵۲ء

فکر زندانِ مصائب سے نکل سکتی ہے
زندگی اپنے قوانین بدل سکتی ہے
زیر کر دے اگر عفریتِ ہوس کو احساس
سامنے آئی ہوئی موت بھی ٹل سکتی ہے

۱۲/۴/۵۲ء

نغموں کی دل کشی مرے سوزِ سخن میں ہے
پھولوں کی تازگی میرے داغِ کہن میں ہے
صیاد بار بار نہ دے طعنِ بے کسی
میں خود قفس میں ہوں مری دنیا چمن میں ہے

۱۵/۴/۵۲ء

کارواں گم، راہبر مفقود ہے
راہِ امن و آشتی مسدود ہے
المدد اے شمعِ اعجازِ اُمید
کالے کوسوں منزلِ مقصود ہے

۱۹/۴/۵۲ء

رنگِ بہار آئینہ دارِ اماں نہیں
نورِ جبینِ صبحِ چمن سے عیاں نہیں
چہرے اُداس اُداس ہیں سانسیں گھُٹی گھُٹی
کیسے کہوں ہیں آتشِ گل ہیں دھواں نہیں

۲۲/۴ ۶۵۲

سو بلائیں ہیں ایک جی کے لئے
وقت ہے سانس مانگنی کے لئے
زندہ درگور کیسے ہو جائیں
ہم تو مرتے ہیں زندگی کے لئے

۱۱/۵ ۶۵۲

مینائے تہیِ امن بھر سکتا ہے
رنگِ رخِ تدبیر نکھر سکتا ہے
مایوس نہ ہوں قیدئ زندانِ شب
خورشید بھی گردوں سے اتر سکتا ہے

۱۴/۵ ۶۵۲

جرم کی قید نہیں، قید کی میعاد نہیں
مہلتِ عرض نہیں، فرصتِ فریاد نہیں
نغمے آزادی کے اس باغ میں کیسے گاؤں
سروِ آزاد بھی جس باغ میں آزاد نہیں

۱۲/۵ ۶۵۲

کچھ زور چلا نہ بے بسی کا
کھلتا ہی گیا بھرم ہنسی کا
باندھی جو ہوا خزاں نے آکر
منہ بند ہوا کلی کلی کا

۷/۸ ۶۵۲

تصویر کشِ وقت ہے بیتابیٔ عالم
صورت گرِ احساس ہے جوششِ غمِ پیہم
اللہ رے اعجازِ اثرِ سوزِ دروں کا
ہونٹوں پہ شگوفوں کے ہیں تبخالۂ شبنم

۷/۱۰ ۶۵۲

درِ قصرِ سحر وا ہو رہا ہے
اُجالا روئے گیتی دھو رہا ہے
قفس کا در مگر کون آ کے کھولے
مقدر آشیاں میں سو رہا ہے

۹/۲ ۶۵۳

زورِ آتش سرد ہے سوزِ جگر کے سامنے
بادِ صرصر گرد ہے آہِ سحر کے سامنے
تنکے تنکے سے نشیمن کے دھواں اُٹھنے لگا
برق اب پانی بھرے آ کر شرر کے سامنے

۲۹/۲ ۶۵۳

عالمِ تیرہ شبی چشمِ عزا دار میں ہے
ماتمِ بے گنہی قلبِ گراں بار میں ہے
نغمۂ صبح خدا را نہ سنا مطربِ وقت
عکسِ ماضی ابھی آئینۂ افکار میں ہے

۱۱/۳ ۶۵۳

رت ہے احساس کو جس کی، وہ فضا ہو تو سہی
حقِّ نظارگی آنکھوں سے ادا ہو تو سہی
میں تو ایمان اجالے پہ ابھی لے آؤں
شمعِ تصویر میں امکانِ ضیا ہو تو سہی

۱۴/۴ ۶۵۳

رنگِ شفقِ صبح سکوں زا تو نہیں ہے
موجِ نفسِ گُل دمِ عیسا تو نہیں ہے
آ لے ہیں ابھی وقت کے رستے ہوئے ناسور
امروز پھر امروز ہے فردا تو نہیں ہے

۲۹/۹ ۶۵۳

تقدیر اپنے حال پہ جی بھر کے رو تو لے
تدبیر داغِ چہرۂ امید دھو تو لے
کیسے ابھی سے دیدۂ ارماں میں آئے نور
احساس گرم و سردِ زمانہ سمو تو لے

۲۲/۹ ۶۵۳

دیکھتا کیا ہے سوزِ صبر گداز
سوچتا کیا ہے جذبِ حشر نواز
کھینچ لا اب اُسے بھی تا بہ قفس
اُڑ گئی ہے جو طاقتِ پرواز

۱۰/۱۱/۵۳ء

خدمتِ دل

نہ جھجھکا سازشِ فکر و نظر سے
نہ سہما کاوشِ مژگانِ تر سے
خیال آیا ہے جب ان کی خوشی کا
ہنسا ہوں میں لبِ زخمِ جگر سے

۱۲/۲/۶۵

بظاہر کاوشِ مژگانِ تر کچھ اور کہتی ہے
خموشی جذبِ پنہاں کی مگر کچھ اور کہتی ہے
کہاں کا مدعا، کس کی تمنا، کیسی ناکامی
محبت سے محبت کی نظر کچھ اور کہتی ہے

۳۰/۴ ۵۳ء

بدخواہ تھا کسی کا، نہ دشمن کسی کا تھا
غم کا شریکِ حال تھا، ساتھی خوشی کا تھا
اتنی خطا ضرور رہے میرے خلوص کی
تم پر بھی اعتبار مجھے دوستی کا تھا

۹/۵ ۵۳ء

تمنا بے نیازِ این و آں معلوم ہوتی ہے
بہارِ عالمِ دل بے خزاں معلوم ہوتی ہے
تعال اللہ یہ اعجاز احساسِ محبت کا
مجھے ہر سانس عمرِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

۱۴/۶ ۵۳ء

کارواں

(غزلیں)

قدم قدم پہ حوادث نے رہنمائی کی
رواں ہے جادۂ منزل پہ کاروانِ خیال
یعقوبؔ عثمانی

نغمۂ حیات

طوفاں کی زد پہ اپنا سفینہ جب آگیا
ساحل کو موج، موج کو ساحل بنا گیا

منہ تکتے تکتے تھک گئیں حرماں نصیبیاں
ہر انقلاب، شوق کی ہمت بڑھا گیا

ذوقِ نظر کی جرأتِ بیباک الاماں
رنگِ حیات بن کے فضاؤں پہ چھا گیا

تھرا کے شمعِ انجمنِ عیش بجھ گئی
نیرنگِ نورِ صبح وہ منظر دکھا گیا

عجزِ رہِ نیاز کے قربان جائیے
نقشِ قدم کو نقشِ تمنا بنا گیا

اتنا کرم بھی جبرِ محبت کا کم نہیں
گھٹ گھٹ کے مرنے والوں کو جینا سکھا گیا

شعلے سے کیوں لپکتے ہیں گلشن سے بار بار
یعقوبؔ کیا بہار کا موسم پھر آگیا؟

حل ہی نہ ہو جس کا، وہ معما تو نہیں ہے
مکتوبِ ازل حرفِ تمنا تو نہیں ہے

دل ہی کی خدائی ہے یہاں آج بھی اے دوست
پابندِ نظر کیف کی دنیا تو نہیں ہے

بے بہرۂ عرفانِ محبت ہے ازل سے
سوچا ہے تجھے عقل نے دیکھا تو نہیں ہے

اندوہ بداماں نہ ہو خود موجِ ترنم
آواز کا ہر شعبدہ نغما تو نہیں ہے

ہر راہ نظر آنے لگے مجھ کو رہِ راست
بے راہ روی، تیرا یہ منشا تو نہیں ہے

غم کیا اگر آزارِ مسلسل ہے مری زیست
منت کشِ اعجازِ مسیحا تو نہیں ہے

یعقوب سنانا ہے مجھے دل کی زباں میں
افسانے کا پہلو کوئی تشنا تو نہیں ہے

۲۵-۸-۶۵

ساغرِ دل رکھ کے مینائے سحر کے سامنے
خود پرستی جھوم اُٹھتی ہے نظر کے سامنے

خاک اِتراتی ہیں احساسِ اثر کے سامنے
مشکلیں آئیں بھی تو فکر و نظر کے سامنے

کہہ گئے رودادِ مستقبل زبانِ حال سے
ماہ و انجم ، بے خیالی میں سحر کے سامنے

دیکھتی کیونکر محبت اپنے جلووں کا فروغ
دل کا آئینہ تھا حسنِ خود نگر کے سامنے

مسکراہٹ نے بڑھا دی آنسوؤں کی آب و تاب
کھائی زک بیداد نے بیداد گر کے سامنے

ہو گیا منزل پہ آکر رہبری کا راز فاش
ہنس پڑی گم کردہ راہی راہبر کے سامنے

رنگِ افسانہ بدل سکتا ہے یعقوبؔ، آج بھی
مختلف پہلو ہیں عمرِ مختصر کے سامنے

طوفاں پناہ موجیں بپھری ہی تھیں تو کیا تھا
لیکن سفینہ دشمن، قسمت سے ناخدا تھا
ذوقِ طلب یہاں تک برباد ہو چکا تھا
ہر نقشِ راہِ منزل، منزل بنا ہوا تھا
ان واہموں کو جن میں انساں گھرا ہوا تھا
تنہا ضمیرِ فطرت محسوس کر رہا تھا
کب تک نباہ کرتا حرماں نصیبیوں سے
پندارِ عزمِ محکم، تقدیر آشنا تھا
اب جاکے لی ہے کروٹ احساسِ کہنگی نے
مدت سے اپنی رو میں خود وقت بہہ رہا تھا
تاریخ اب نہ کھینچے اس دور کے مرقعے
ہر انقلابِ گیتی جب ایک حادثا تھا
نالاں ہے آج اسی سے یعقوب آدمیت
جس خواجگی پہ کل تک انساں مٹا ہوا تھا

۶۵۰ ۲۶/۱۱

تضاد اچھا نہیں طرزِ بیاں کا ہم زبانوں میں
حقیقت کو چھپاتا جا رہا ہوں داستانوں میں
سبھی تو آج برگشتہ ہیں عظمت سوز پستی سے
مچا رکھی ہے اک ہل چل زمیں نے آسمانوں میں
سمجھتا ہوں میں بے مفہوم سی آواز شکوے کو
مصیبت خود مدد کرتی ہے آکر امتحانوں میں
مرا آئینۂ احساس حیراں ہو نہیں سکتا
یقیں کا نور پیدا کر ہی لیتا ہے گمانوں میں
بنا رکھا ہے بدتر از قفس خود نیا اسیری نے
سوا تنکوں کے اب کیا رہ گیا ہے آشیانوں میں
نیا اک معبدِ امید بھی تعمیر کرنا ہے
عنادل معتکف کب تک رہیں گے گلستانوں میں
مری نیرنگیاں چھانے لگی ہیں رنگ محفل پر
بہت کچھ فرقِ یعقوبؔ آچلا ہے داستانوں میں

۲۰-۱۲-۶۵

مذاقِ کاوشِ پنہاں، اب اتنا عام کیا ہوگا
زباں پر ہم صفیروں کی، مرا پیغام کیا ہوگا
کہے دیتا ہے خود آغاز ہی، انجام کیا ہوگا
تری آتش بیانی سے چراغِ شام کیا ہوگا
نہ گھبرا باغباں بلبل کی رسمی نوحہ خوانی سے
بھلا ان چند تنکوں کا نشیمن نام کیا ہوگا
فدائے کس مپرسی ہوں، نثارِ تلخ کامی ہوں
مرے عزم طلب کا مدعا آرام کیا ہوگا
فریب اندر فریب، آتش در آتش، اے معاذ اللہ
خدا ناکردہ فصلِ گل، ترا انجام کیا ہوگا
ارادت کا بھرم کھل جائے گا بیعت نہ لے ساقی
گرفتارِ سلاسل ہوں طوافِ جام کیا ہوگا
یہ کیوں سمجھاؤں میں یعقوبؔ نوکِ نشترِ غم کو
جو باقی رہ گیا ہے خونِ ہفت اندام، کیا ہوگا

۶۵۰۱۱/۱۲

پہرے نظر کے دل پہ بٹھاتا نہیں کبھی
میں زندگی کو موت بناتا نہیں کبھی
طوفاں کا حوصلہ میں بڑھاتا نہیں کبھی
ساحل کی سمت بھول کے جاتا نہیں کبھی

اللہ ری خود شناس محبت کی بازپرس
مقصد حدودِ شوق میں آتا نہیں کبھی

اے دوست مجھکو طعنۂ تقلیدِ غم نہ دے
میں دل کسی خوشی کا دکھاتا نہیں کبھی

غنچے نہیں ہیں وہ، گلِ شمعِ خموش ہیں
جھونکا خزاں کا جن کو ہنساتا نہیں کبھی

تنقید جب حیات پہ کرتا ہے انقلاب
مطلب کی کوئی بات چھپاتا نہیں کبھی

طوطیٔ فکر کیوں نہ ہو یعقوبِ نکتہ سنج
ماضی کا آئینہ میں دکھاتا نہیں کبھی

موجزن سینۂ صرصر میں ہیں ارماں کچھ اور
گھٹ چلا فاصلۂ ساحل و طوفاں کچھ اور
ظلمتِ شب سے ہیں آثار نمایاں کچھ اور
ہو گیا زرد رُخِ شمعِ شبستاں کچھ اور
کیسے کھولے ابھی انسانیت اپنا پرچم
آتو لیں صف میں نظر بازوں کی، انساں کچھ اور
ہاں لبِ زخم یہی وقتِ گل افشانی ہے
شورشیں لائی ہیں تقریر کے عنواں کچھ اور
پیش بھی کرنی ہے گلچیں سے تجھے تاریخِ بہار
غور سے دیکھ لے اوراقِ پریشاں کچھ اور
عیشِ منزل کے تصور سے بھی آگے ہیں قدم
آج ہے مشورۂ کاوشِ پنہاں کچھ اور
ذرّہ ذرّہ ہے تمنّاؤں کا مدفن یعقوبؔ
رنگ لائے گی ابھی خاکِ گلستاں کچھ اور

تکلیف دے کہاں تک آخر کوئی ہنسی کو
آنسو ہی اب منائیں روٹھی ہوئی خوشی کو

اب تک سراہتی ہیں خود کامیاں اُسی کو
نفرت سے دیکھتی ہے تکمیل جس کمی کو

زندہ حقیقتوں سے ٹکرا کے بے حسی کو
بیدار کر دیا ہے فطرت نے آگہی کو

کہنے کو کہہ سنایا مژدہ نیا صبا نے
دیکھا تو آ رہی تھی ہچکی کلی کلی کو

اللہ ری سخت کوشی امروزِ بے کسی کی
ہمت دلا رہی ہے خود موت زندگی کو

کیسے نہ سانپ لوٹیں سینے پہ تیرگی کے
تارے بلا رہے ہیں چھپ چھپ کے روشنی کو

یعقوبؔ ایک چپ میں ٹل جائیں سو بلائیں
مطلب اگر نہ چھیڑے بے وجہ خامشی کو

شوق کی کم نگہی بھی ہے گوارا مجھ کو
غم تو غم آج خوشی بھی ہے گوارا مجھ کو

جستجو ساتھ ہے شمعِ رہِ منزل بن کر
اپنی بے راہ روی بھی ہے گوارا مجھ کو

لذتِ زیست بہر طور سبھی کو ہے عزیز
زہر مینائے خودی بھی ہے گوارا مجھ کو

سوزنِ رحم و کرم کرتی ہے کیوں سعئ رفو
چاکِ دامانِ تہی بھی ہے گوارا مجھ کو

آپ للِلّٰہ نہ فرمائیں زیادہ زحمت
اب توجہ کی کمی بھی ہے گوارا مجھ کو

صرف تردامنئ دل ہی پہ اصرار نہیں
چشمِ پرنم کی کمی بھی ہے گوارا مجھ کو

جرأتِ عرضِ تمنا سے ہوں بدظن یعقوب
ضبط کی کم سخنی بھی ہے گوارا مجھ کو

۶۵۱ ۲۲/۳

کرم کے اس دورِ امتحاں سے وہ دورِ مشقِ ستم ہی اچھا
نہ زندگی کی خوشی ہی اچھی نہ بے ثباتی کا غم ہی اچھا

تلاش کی سعئ رائگاں پر نظر تو آتے ہیں غرقِ حیرت
سخن طرازئ رہنما سے سکوتِ نقشِ قدم ہی اچھا

ضیائے نورِ یقیں ہے رہبر حیات کی تیرہ وادیوں میں
بجھا کے دیکھیں بجھانے والے چراغِ طاقِ حرم ہی اچھا

طلب کی عظمت، طلب کی زحمت، طلب کا حاصل، طلب کی لذت
نہ خوفِ سود و زیاں ہی اچھا نہ خطرۂ بیش و کم ہی اچھا

مآل کیا ہوگا باغباں تو سکوں فراموش ارتقا کا
نظر بھی آنے لگی چمن میں بہارِ باغِ ارم ہی اچھا

مجھے اسی پر ہے ناز ہمدم شکستہ ساغر یہ ہے تو اپنا
کسے ستاتا ہے ذکرِ ماضی بلا سے تھا جامِ جم ہی اچھا

ہوس یعقوبؔ نکتہ چیں کیوں نظر ہی تو ہے یہ اپنی اپنی
نگاہِ ذوقِ بلند میں ہے سرِ اطاعت کا خم ہی اچھا

۱۹۵۱ء

سو بار کیے تیرگیٔ شب نے اشارے
پروازِ نظر کو مری تکتے ہیں ستارے

کیا خاک کروں صبحِ تمنا کے نظارے
اب تک سرِ مژگاں نظر آتے ہیں ستارے

آئینۂ ماضی کا خود امروز ہے دشمن
ڈوبے ہوئے سورج کو سحر اب نہ اُبھارے

آغوش میں گمنامی کے جا بیٹھیں ابھی سے
جینا ہو جنھیں عظمتِ ماضی کے سہارے

اب جرأتِ خودسر کا ہر اقدام بجا ہے
کب تک کوئی خوابیدہ مقدر کو پکارے

ناداں یہ سمجھتے ہیں وہی موسمِ گل تھا
رو رو کے جو دن ہیں نے گلستاں میں گذارے

یعقوبؔ یہ اُلجھے ہوئے گیسوئے تمدن
مشاطۂ فطرت ہی سنوارے تو سنوارے

۶۵۱ ۱۷/۴

دور سے سلام اپنا ایسے مہرِ دانش کو
آج تک ترستا ہے ذرہ ذرہ تابش کو

خاک دے جگہ دل میں شمع کی نوازش کو
وقت خود سمجھتا ہے روز و شب کی سازش کو

جامِ نو میں بھر دیں گے سازِ نو میں بھر دیں گے
لے کے بزمِ عشرت سے روحِ رنگ و رامش کو

غور اُنھی پہ کرتے ہیں اب مرے وہی آقا
کھیل جانتے تھے جو میری ہر گذارش کو

عزمِ شوق اے تقدیر کیا عجب بدل ہی دے
میری اس گذارش سے تیری اُس نگارش کو

حوصلے بڑھاتے ہیں ولولے مناتے ہیں
رنج و غم کے پردے میں زندگی کی خواہش کو

ان گھٹاؤں سے یعقوبؔ خاک ہو امید اس کی
رو رہی ہے چشمِ غم جس کرم کی بارش کو

۱۵۱ ۲۶/۴

میں چاہوں بھی تو ضبطِ گفتگو میں لا نہیں سکتا
سمجھنے پر بھی دل کا مدعا سمجھا نہیں سکتا

بھلا ایسی تہی داماں تمناؤں سے کیا حاصل
بہلنے پر دل آمادہ ہے اور بہلا نہیں سکتا

خدا محفوظ رکھے خوفِ آسیبِ اسیری سے
میں گلشن میں بھی آزادی کا نغمہ گا نہیں سکتا

رگِ گل سے بھی نازک تر ہیں تنکے آشیانے کے
انھیں گلچیں ہر اندازِ نوازش بھا نہیں سکتا

بھرا جائے گا کب تک خونِ ماضی نبضِ فردا میں
اب اس پہلو پہ نظمِ قلبِ گیتی آ نہیں سکتا

کسے فتنہ سمجھ کر اپنی محفل سے اٹھاتا ہے
ضمیر امن اس دھوکے میں، ناداں آ نہیں سکتا

سحابِ فکر بھی یعقوب پابندِ فضا نکلا
چمن کی خاک پر رنگِ سخن برسا نہیں سکتا

651 ½

آگہی کو لائے کون ظرفِ کم نگاہی تک
غرقِ فکرِ فردا ہے غم کی بے پناہی تک

پا کے دامنِ طوفاں موج موج کھُل کھیلی
رہ گئی سفینے کو بارہا تباہی تک

اب بھی کیا یہ سوجھیں گے داغ اپنے چہرے کے
آئینہ دکھاتی ہے وقت کو سیاہی تک

آسماں نے لی کروٹ کانپ اٹھا دلِ امروز
آفتاب آ پہنچا بامِ قصرِ شاہی تک

لائقِ ستائش ہے اعتمادِ عفوِ اپنا
عرض کر دیا ان سے جرمِ بے گناہی تک

کس کو کس کو لے جائے پاس آ کے خودِ منزل
بستۂ سلاسل ہیں، راہبر سے راہی تک

ولولے ابھی کیسے نغمہ ریز ہوں یعقوبؔ
گم ہے لرزشِ دل میں شورِ دادخواہی تک

بڑھتے ہوئے جوشِ طوفاں سے ٹکرا کے سفینہ مشکل کا
دل توڑ گیا ہے موجوں کا رخ پھیر گیا ہے ساحل کا

تعبیر ہے خوابِ فردا کی بدلا ہوا نقشہ محفل کا
امروز کے لب پر کچھ نہ سہی پیغام تو ہے مستقبل کا

اُٹھنے کو نگاہِ لطف اٹھی ملنے کو سکوں کی بھیک ملی
کشکول مگر خالی ہی رہا ارماں کے بھوکے سائل کا

غلطاں سے ہے نگاہِ دوراں میں رقصاں ہے دماغِ حیراں میں
ہلکی سی جھلک بیداری کی دھندلا سا تصور حاصل کا

احساس کو دھوکا دے نہ سکی تاروں کی ہنسی کرنوں کی خوشی
کہہ ڈالا شمع فروزاں نے سربستہ راز بھی محفل کا

اللہ رے فریبِ خوش نظری اللہ رے فروغِ بوالعجبی
منہ تکتی ہے جوشِ حیرت میں ایک ایک حقیقت باطل کا

یعقوب سوادِ شامِ الم بڑھ بڑھ کے ڈراتا ہے کس کو
ہر ذرۂ خاکِ راہِ طلب آئینہ ہے صبحِ منزل کا

۲۴/۹ ۶۵۱

ادا سنجِ صبح و مسا ہو چلے ہیں
حوادث مآل آشنا ہو چلے ہیں

تقاضا شناسِ فضا ہو چلے ہیں
اُجالے پہ تارے فدا ہو چلے ہیں

اُداسی کے انداز اندھیرے کے تیور
رُخِ صبح کا آئینا ہو چلے ہیں

ڈرایا تھا پیچیدہ راہی نے جن سے
وہی خواب منزل نما ہو چلے ہیں

مبارک ہو اے فکرِ فردا مبارک
حواس انقلاب آزما ہو چلے ہیں

نگاہوں میں کھنچ آئی مطلب کی ہر شئے
تہی دامنِ مدعا ہو چلے ہیں

وہ جوشِ طلب ہو کہ یعقوبِ ہمت
امیدوں کے سب ہمنوا ہو چلے ہیں

۲۲/۱۲ ۵۱ء

خوش فہمیوں کو غور کا یارا نہیں رہا
طوفاں کی زد سے دور کنارا نہیں رہا

بڑھ بڑھ کے ڈھونڈتے ہیں پناہیں نئی نئی
فتنوں کو تیرگی کا سہارا نہیں رہا

بیتابیاں بہائے تمنا بڑھا گئیں
نقدِ سکوں گنوا کے خسارا نہیں رہا

باقی منافعین کے دم سے بھرم احتیاج کا
ہمت کو وہ کرم بھی گوارا نہیں رہا

نازاں ہے اپنی فتح پہ اس طرح موت آج
جیسے کوئی حیات کا مارا نہیں رہا

خورشیدِ انقلاب کا آئینہ ہو تو ہو
مژگاں سے گر کے اشک ستارا نہیں رہا

یعقوبؔ لمحے لمحے سے ظاہر ہے بے رخی
ساحل نوازِ وقت کا دھارا نہیں رہا

نگاہِ بدگماں ہے اور میں ہوں — فریبِ آشیاں ہے اور میں ہوں

شریکِ بےکسی آئے کہاں سے — زمیں پر آسماں ہے اور میں ہوں

اِدھر کیا گھورتی ہے کس مپرسی — مرا عزمِ جواں ہے اور میں ہوں

سراپا گوش ہے صبحِ شبِ تار — کسی کی داستاں ہے اور میں ہوں

گھٹا جاتا ہے دم اے سوزِ احساس — تہہِ دامن دھواں ہے اور میں ہوں

حوادث اب جسے چاہیں سراہیں — نصیبِ دشمناں ہے اور میں ہوں

قفس نغموں سے گونج اٹھتا ہے یعقوب
امیدِ خوش بیاں ہے اور میں ہوں

۲۵/۴ ۶۵۲

وفاؤں سے کچھ کم نہیں ہیں جفائیں
کسے یاد رکھیں کسے بھول جائیں

اب آئیں تو احساس کو ساتھ لائیں
بہاریں گلستاں میں تنہا نہ آئیں

ابھی تو قدم حوصلوں کے جمے ہیں
ابھی سے نہ زخمِ جگر مسکرائیں

جگہ بھی تو دے عبرتِ حشر ساماں
نگاہوں میں کیا خاک جلوے سمائیں

پذیرائی دامن بچائے گی کب تک
بہت ٹھوکریں کھا چکیں التجائیں

فسانوں کی دنیا میں اوجِ حقیقت
سمجھائیں تو یعقوبؔ کس کو سمجھائیں

۱۰/۹ ۶۵۲

تو اگر مونسِ تنہائی ہو — خود سکوں دل کا تمنّائی ہو

شوق ہی شوق کا دے بڑھ کے جواب — التجا ہو نہ پذیرائی ہو

دھڑکنیں دل کی یہاں تک تو بڑھیں — ہر نفس روکشِ گویائی ہو

یوں لپکتے ہیں گلوں سے شعلے — جیسے گلشن میں بہار آئی ہو

حسن آزردہ محبت دل گیر — کون دامن کشِ رعنائی ہو

موت سے کھیل تو اس طرح سے کھیل — زندگی آکے تماشائی ہو

نبض امروز نہ دیکھیں یعقوبؔ
جن کو دعوائے مسیحائی ہو

وہ کون سے خطرے ہیں جو گلشن میں نہیں ہیں
ہم موت کے منہ میں ہیں نشیمن میں نہیں ہیں
یہ جشنِ طرب اور یہ سب بے رنگئ محفل
دو پھول بھی کیا وقت کے دامن میں نہیں ہیں
چھپ چھپ کے کسے برقِ ہوس ڈھونڈھ رہی ہے
گنتی کے وہ خوشے بھی تو خرمن میں نہیں ہیں
امروز کے دُکھتے ہوئے دل کی ہیں صدا ہول
دیروز کے نوحے مرے شیون میں نہیں ہیں
چاکِ جگر اے دستِ کرم سی تو رہا ہے
گرہیں تو کہیں رشتۂ سوزن میں نہیں ہیں
مجبور اب اتنا بھی اسیروں کو نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں کچھ طوق جو گردن میں نہیں ہیں
رنگِ نگہِ شوق بھرے کون چمن میں
تنکے بھی تو یعقوب نشیمن میں نہیں ہیں

صبر کس کا پڑ گیا افلاک پر
بجلیاں تک ٹوٹتی ہیں خاک پر

کل ہوا پوچھے گی ساحل کا مزاج
آج اِترا لے خس و خاشاک پر

تک رہا ہے راہ صبح ایک ایک خواب
جمگھٹا ہے سرحدِ ادراک پر

کیا یہی شہہ کار ہیں تعمیر کے
کچھ گھروندے سے بنے ہیں خاک پر

فتنے فتنے کا اُتر جاتا ہے مُنہ
ہر بیانِ جرأتِ بیباک پر

آپ کے دشمن سنیں طعنِ جفا
ایسی کیا گذری دلِ صد چاک پر

تھک گئے یعقوبؔ شاید اہلِ بزم
ہنستے ہنستے دیدۂ نمناک پر

۶۵۳ ۲۲/۳

سُنائیں کسے اجنبی انجمن میں
حدیثِ محبت زبانِ چمن میں
ضیائے تبسم کو روتی ہے شبنم
اندھیرا ہے بزمِ گل و یاسمن میں
بسادی ہے صدیوں نے بوئے غلامی
خُمِ زندگی کی شراب کہن میں
نگاہِ وطن بے سبب کھینچ رہی ہے
ہماری جگہ ہے ضمیرِ وطن میں
سیئے گا کسے آپ کا دستِ احساں
کوئی چاک بھی تو نہیں ہے کفن میں
خزاں دوستی میرا مشرب نہیں ہے
بہار آئے لیکن نئے پیرہن میں
حوادث کا احساں ہے یعقوبؔ ادب پر
نئی روح پھونکی ہے جسمِ سخن میں

۶۵-۲۳-۳

نہ ارماں بن کے آتا ہے نہ حسرت بن کے آتا ہے
خیالِ آدمیت آج عبرت بن کے آتا ہے

کدھر ہیں مستِ نخوت آئیں آئیں سامنے آئیں
زوالِ خود سری آئینِ قدرت بن کے آتا ہے

فغانِ دل ٹھہر وہ دیکھ افق پر روشنی پھیلی
اثر آتا ہے اور بیدار قسمت بن کے آتا ہے

گذر مشکل ہے مایوسی کا اُن ذہنی فضاؤں میں
تخیل تک جہاں جوشِ طبیعت بن کے آتا ہے

ستمگر دیکھ ہی لیں گے کبھی شکلِ ہزیمت بھی
ابھی تو وقت آثارِ ہزیمت بن کے آتا ہے

یہی تو پیش خیمہ انقلابِ نو کا ہے ہمدم
ہر احساس اِن دنوں تازہ مصیبت بن کے آتا ہے

کہاں تک ضبط کو یعقوبِ پابندِ ادب رکھیں
جو غم آتا ہے ایمائے مشیت بن کے آتا ہے

دم بھر کو مثلِ داغ جو چہرہ چمک گیا
مارے خوشی کے پیرہنِ گل مسک گیا

بے شک یہ جامِ عیش ہے وجہِ نشاط ہے
لیکن مرے حضور اگر میں بہک گیا

اس سخت گیر وقت کی اللہ رے تیرگی
شاید خیالِ یار بھی رستہ بھٹک گیا

جمنے لگی تھی گرد ندامت کی تہہ بہ تہہ
وقت آ کے ایک ایک کا دامن جھٹک گیا

بے رحمیوں سے اہلِ چمن کی خدا بچائے
پھولوں پہ گر کے دانۂ شبنم چٹک گیا

قطرہ نہ تھا، وہ ضبط کا میرے نچوڑ تھا
مژگاں تک آتے آتے جو آنسو ٹپک گیا

یعقوبؔ یہ تو رنگ جمانے کا وقت تھا
آتے ہی کیا بہار کا ماتھا ٹھنک گیا

۲۵/۳ ۔ ۱۹۸۱

صبر خود اُکتا گیا، اچھا ہوا
کچھ تو بوجھ احساس کا ہلکا ہوا

وہ غرورِ ہوش مندی کیا ہوا
جو قدم پڑتا ہے وہ بہکا ہوا

چھیڑ بیٹھا وقت اپنی راگنی
ساز پر جب آپ کا قبضہ ہوا

تک رہا ہے خود انھی کی انجمن
فتنہ فتنہ ان کا چونکایا ہوا

روپ بدلا ہے سحر کا رات نے
دیکھنے والو تمہیں دھوکا ہوا

کر رہے ہو کس سے تم ذکرِ چمن
غنچہ غنچہ ہے مرا دیکھا ہوا

آپ کج رو ہیں کہ سب کج فہم ہیں
حل بڑی مشکل سے یہ عقدہ ہوا

مصلحت یعقوب کیوں ہے دم بخود
راز کس کی بزم کا افشا ہوا

۲۷/۳ ۵۳ء

نئے مرحلے پیش آنے لگے ہیں
قدم خضر کے ڈگمگانے لگے ہیں

مبارک جنونِ قیادت مبارک
گریباں تک اب ہاتھ جانے لگے ہیں

قدامت کی آتش فروز آندھیوں سے
سبھی آج دامن بچانے لگے ہیں

نئے پیچ زلفِ سیاست میں دے کر
وہ فتنوں کو پھر سر چڑھانے لگے ہیں

جما زندگی پھر سے بازار اپنا
شگوفوں کے خریدار آنے لگے ہیں

نہ ہوں اُن سفینوں سے مایوس ساحل
جو طوفاں میں پھنس کر ٹھکانے لگے ہیں

اُمنگوں سے گھل مل کے یعقوب ارماں
فضائے تخیل پہ چھانے لگے ہیں

فغانِ صبح لیتا جا، نوائے شام لیتا جا
صلہ کوشش کا اپنی حشرِ بے ہنگام لیتا جا
ٹھہر اے ضبطِ برگشتہ نہ یوں ہمت سے بدظن ہو
یقیں کی پیشکش، احساس کا انعام لیتا جا

کبھی تو بے گناہی تیری اے دل رنگ لائے گی
خوشی سے اپنے سر الزام پر الزام لیتا جا
نہ جا سوئے فلک اس طرح خالی ہاتھ اے شیون
فضاؤں کے لئے تسکین کا پیغام لیتا جا

میں کانٹوں سے بھی بہلا لوں گا جی اے خوفِ ناکامی
مرے کس کام کا گلدستۂ اوہام، لیتا جا
نہ گھبرا وادیٔ ارماں کے اس وقتی اندھیرے سے
تھکے ماندے مسافر دم کے دم آرام لیتا جا

وفا کا ذکرِ یعقوب اور یہ بے ربط سے فقرے
کرم نا آشنا بندے کرم کا نام لیتا جا

۶۵۳ ۱۴/۴

محبت کی ہیں بے پایاں پناہیں
نکل ہی آئیں گی جینے کی راہیں

معاذ اللہ او وعدہ فراموش
زباں کی طرح پلٹی ہیں نگاہیں

ٹھکانا ہے سرِ عرش التجا کا
کسے ٹھکرا رہی ہیں بارگاہیں

میں قرباں آپ کی معصومیت کے
یہ دعویٰ اور یہ نیچی نگاہیں

بظاہر دوست، دشمن بھی نہیں ہیں
اب ایسوں سے بھلا کیونکر نباہیں

مآلِ شعلۂ غم سوچ رکھیں
ہوا تو دے رہی ہیں سرد آہیں

یقیں کا رنگ جم سکتا ہے اب بھی
تمنائیں اگر یعقوب چاہیں

۶۵۳ ۵/۲۰

زباں کچھ اور کہتی ہے نظر کچھ اور کہتی ہے
بظاہر یہ توجہ چارہ گر کچھ اور کہتی ہے

زمانہ نغمہ پیرائی کا جب آئے گا، آئے گا
ابھی تو شدّت سوزِ جگر کچھ اور کہتی ہے

بھلا آپ اور اخفائے حقیقت، اے معاذ اللہ
زبانِ خلق جھوٹی ہے اگر کچھ اور کہتی ہے

کوئی کس طرح دھوکا کھائے اس آتش بیانی کا
اُداسی تیری اے شمعِ سحر کچھ اور کہتی ہے

اسی تشخیص پر اترا رہا تھا ایک مدت سے
مسیحا دیکھ، نبض بحر و بر کچھ اور کہتی ہے

تری عظمت کا منکر تھا نہ ہوں اے رہبرِ کامل
اب اس کو کیا کروں میں رہگذر کچھ اور کہتی ہے

بھرم یعقوب کھلنے ہی کو ہے اب آسمانوں کا
زمیں سے گردشِ شمس و قمر کچھ اور کہتی ہے

٥٣ ۱۱/۵

کس کی مرضی پا گیا ، کس کا اشارا ہو گیا
سوزِ پنہاں شوق بن کر آشکارا ہو گیا
کھیلتا رہتا تھا کل تک جس کی ہر ہر موج سے
آج اُسی طوفان سے بدظن کنارا ہو گیا
اس سے بڑھ کر اور کیا کرتے کرم کا احترام
زہرِ جامِ تشنہ کامی تک گوارا ہو گیا
دم لگے دم آرام لے لیں چھیڑتے ہیں پھر ابھی
یہ نہ سمجھو ختم افسانہ ہمارا ہو گیا
زندگی کا ذکر تو ہے وہ خیالی ہی سہی
جینے والوں کے لئے کچھ تو سہارا ہو گیا
اب تو لے کروٹ خدارا اے سپہرِ کج مدار
صبح کے پردے میں بھی شب کا نظارا ہو گیا
آتشِ احساس نے چمکا دیا کچھ اس طرح
داغِ دل یعقوب ، قسمت کا ستارا ہو گیا

قیادت کی غلط راہوں سے بددل ہوتے جاتے ہیں
قدم خود آشنائے راہِ منزل ہوتے جاتے ہیں

انھیں کے آئینہ میں شکل کل دیکھیں گے مقصد کی
جو ارماں آج امیدوں کا حاصل ہوتے جاتے ہیں

بدلنا ہی پڑے گا وقت کو با رنگِ افسانہ
حقیقت سے بہت دور اہل محفل ہوتے جاتے ہیں

یہی اعجاز کیا کم ہے ہمارے جوشِ وحشت کا
خرد کے مستقل دعوے تو باطل ہوتے جاتے ہیں

بہار اس مرتبہ رازِ چمن سمجھا گئی شاید
نشیمن سے کنارہ کش عنادل ہوتے جاتے ہیں

بالآخر نقش اُبھریں گے ان ہی پرشادمانی کے
بظاہر پردہ ہائے فکر حائل ہوتے جاتے ہیں

نکل سکتی ہے گنجائش یقیں کی اب خیالوں میں
گماں کے وسوسے یعقوبؔ زائل ہوتے جاتے ہیں

۲۳ / ۹ / ۶۵

شوق مصروفِ تیز گامی ہے
ہر نفس کیف کا پیامی ہے
اک معمہ ہے ان کی بے مہری
آج تک اس یقیں میں خامی ہے

لذتِ سوزِ دل نہ پوچھ اے دوست
تلخ کامی بھی شاد کامی ہے
اپنی بے التفاتیوں پہ نہ جا
میری ہر آرزو دوامی ہے
کون اٹھائے ترے خیال کے ناز
صبر کو عذرِ نا تمامی ہے
جو محبت سکوں نواز نہ ہو
وہ محبت نہیں غلامی ہے
جذبِ پنہاں کو آج بھی یعقوبؔ
ان سے دعوائے ہم کلامی ہے

۶۵۳ ۱۶/۱۰

جرأتِ ضبط پہ مغرور نہ ہو جائے کہیں
شادماں پھر دلِ رنجور نہ ہو جائے کہیں

زحمتِ شرحِ وفا آپ نہ فرمائیں حضور
کوئی تردید پہ مجبور نہ ہو جائے کہیں

زخمِ پیشانیٔ حکمت کی خبر لے ناداں
رستے رستے ہی ناسور نہ ہو جائے کہیں

شمع کے گریۂ پیہم پہ بھی آنکھیں نہ کھلیں
بے حسی بزم کا دستور نہ ہو جائے کہیں

سنگِ تدبیر سے خوش فہم اب اتنا بھی نہ کھیل
شیشۂ فکر و نظر چور نہ ہو جائے کہیں

سینچ سکتے ہیں لہو سے بھی چمن زارِ حیات
ہم کو یہ شرط بھی منظور نہ ہو جائے کہیں

فتنے بڑھ بڑھ کے ہوا باندھیں گے کب تک یعقوب
وقت حالات سے مجبور نہ ہو جائے کہیں

چاہتی ہے آخر کیا، آگہی خدا معلوم
کتنے رنگ بدلے گی، زندگی خدا معلوم

کل تو خیر اے رہبر تیرے ساتھ رہرو تھے
آج کس پہ ہنستی ہے گمرہی خدا معلوم

اب بھی صبح ہوتی ہے اب بھی دن نکلتا ہے
جا چھپی کہاں لیکن روشنی خدا معلوم

راستی گریزاں ہے آشتی ہراساں ہے
کس سے کس سے اُلجھے گا آدمی خدا معلوم

اب تو وقت آیا ہے ڈوب کر اُبھرنے کا
کتنی کشتیاں ڈوبیں اور ابھی خدا معلوم

ذوقِ نغمہ پیرائی تو ہی بڑھ کے دے آواز
کب سے غرقِ حیرت ہے خامشی خدا معلوم

صرف بھیک مانگی تھی ہم نے آدمیت کی
کیوں بپھر گئے یعقوبؔ، مدعی خدا معلوم

۶۵۳ ۱۱/ہ

نگاہِ مدعا کا آئینہ بن کر نکلتے ہیں
یہ آنسو ہیں کہ ارمانِ دلِ مضطر نکلتے ہیں
کہیں دھوکا نہ کھا جانا چمک جھوٹی ہے تاروں کی
اندھیرے کا سہارا لے کے یہ باہر نکلتے ہیں
چھٹیں ساحل کے پھندے سے تو سمجھیں ڈوب کر ابھرے
یہاں ٹھہری ہوئی موجوں میں بھی چکر نکلتے ہیں
کبھی سلجھا ہی دے گی صبح نو آکر یہ گتھی بھی
تری موجوں کے بل صبحِ قفس کیونکر نکلتے ہیں
کرم گستر ہیں جنکے تا بہ لب لانے کا مجرم ہوں
یہ فقرے تو زبانِ دہر سے اکثر نکلتے ہیں
سمو دیتی ہے بے کیفی جنھیں یعقوب آہوں میں
محبت کے وہ نغمے بھی سکوں پرور نکلتے ہیں

۲۸/۱۱ ۶۵۴

وسوسوں سے دور کی نسبت بھی ہم رکھتے نہیں
آپ کی فطرت سے امیدِ کرم رکھتے نہیں
ہاں تو بسم اللہ اگر باقی ہوں کچھ ترکش میں تیر
دُھن کے پکے اپنی بربادی کا غم رکھتے نہیں
دور ہی وہ آگیا ہے جینے والوں کے لئے
فکرِ ہستی کے سوا خوفِ عدم رکھتے نہیں
ہے تو مشکل مدعا ہمدم ، وہ دھندلی ہی سہی
کامرانی ہیں خیالِ بیش وکم رکھتے نہیں
ہم سے سیکھیں اہلِ گلشن زندگی کا احترام
وقت کے اصرار پر بھی چشم نم رکھتے نہیں
خاک سوجھے گا انھیں یعقوب ذروں کا فروغ
زورِ نخوت میں زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

زندگی کے ناز اُٹھانے کا قرینہ آگیا
کشمکش کے فیض سے انساں کو جینا آگیا
مطمئن نظروں کو اپنی زحمتِ گردش نہ دے
میکدے والوں کو ساقی زہر پینا آگیا
یہ تو ایجادات پر تنقید تھی حالات کی
عقل و حکمت کی جبیں پر کیوں پسینا آگیا
بوند بھر بھی اہلِ محفل کو ملی ہو تو کہو
دَور میں آنے کو یوں سو بار مینا آگیا
بھر چکا ہے شوق جس میں دل کی رگ رگ کا لہو
کیا وہی منظر دوبارا چشمِ بینا آگیا
مرکزِ طوفان یہی ہے نا خدا ہُو ہوشیار
دیکھنا آغوشِ ساحل میں سفینا آگیا
دشمنِ احساس ہوں یعقوبؔ ممنونِ کرم
چاکِ دامانِ سکوں ہم کو بھی سینا آگیا

۶۵۳ ۲۷/۱۲

امنگوں میں وہی جوشِ تمنا زاد باقی ہے
ابھی دل میں غدار کھے کسی کی یاد باقی ہے

سرِ منزل فریبِ رہنما کا توڑ مشکل
غنیمت ہے کہ شوقِ مرحلہ ایجاد باقی ہے

ہنسی آتی ہے تیرے اس غرورِ دام داری پر
کوئی پھندا ابھی ثابت آج اے صیاد باقی ہے

سحر نے آکے چہرہ وقت کا دھویا تو کیا دھ
فضاؤں پر غبارِ خاطرِ ناشاد باقی ہے

تباہی گھیرنے والی تھی آخر کن سفینوں کو
تہہِ گرداب شورِ "ہرچہ بادا باد" باقی ہے

ابھی سے بندھ گئی ہچکی چمن افروز کلیوں کی
ابھی تو داستانِ نگہتِ برباد باقی ہے

زبانِ وقت کل سے اک نیا افسانہ چھیڑے گی
بہت تھوڑی سی یعقوب آج کی روداد باقی ہے

رنگ و بو کا اندازہ اب کریں چمن والے
پیش کر رہا ہوں میں تازگی کا پیمانہ

یعقوب عثمانی

تصحیح

صفحہ | غلط چھپا ہوا لفظ | اصل لفظ

۳۰ | عقید سے | عقد سے

واصل جملہ یوں ہے "ایک ہی عقد سے پر جب مختلف گوشوں سے"

۸۹ | حدیبیت | حدیبیث

اصل میں "حدیت دل" ہے

۹۷ | نیرنگیاں | بے رنگیاں

مصرعہ یوں ہے ۔ مری بے رنگیاں چھانے لگی ہیں رنگ محفل پر

۱۰۲ | کمی | نمی

مصرعہ یوں ہے ۔ چشم پرنم کی نمی بھی ہے گوارا مجھکو

۱۰۳ | ہوس یعقوب | ہوس ہو یعقوب

مصرعہ یوں ہے ۔ ہوس ہو یعقوب نکتہ چیں کیوں

۱۱۱ | اُٹھتا | اُٹھا

مصرعہ یوں ہے ۔ قفس نغموں سے گونج اُٹھا ہے یعقوب

۱۲۱ | یقین کی پیشکش | یقین کا پیشکش

مصرعہ یوں ہے ۔ یقین کا پیشکش، احساس کا انعام لیتا جا

۱۲۵ | یا رنگ | یہ رنگ

مصرعہ یوں ہے ۔ بدلنا ہی پڑے گا وقت کو یہ رنگ افسانہ